جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ
فروری ۲۰۱۸ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- حکایتِ فسادِ بنی اسرائیل
  ڈاکٹر صہیب حسن
- لوازمِ نجات: سورۃ العصر کی روشنی میں
  شجاع الدین شیخ

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیان القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

خاص ایڈیشن

- دیدہ زیب ٹائٹل
- امپورٹڈ آفسٹ پیپر
- عمدہ طباعت
- مضبوط جلد

سات جلدوں پر مشتمل

مکمل سیٹ کی قیمت: 3600 روپے

عوامی ایڈیشن

- کتابی سائز
- پیپر بیک بائنڈنگ
- امپورٹڈ بک پیپر
- عمدہ طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل

چھ جلدوں پر مشتمل

مکمل سیٹ کی قیمت: 1800 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

جلد : 67

شمارہ : 2

جُمادی الاولیٰ 1439ھ

فروری 2018ء

فی شمارہ 30/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	300 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو لاہور

فون: 36316638 - 36366638

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ——— 5

زینب کا قاتل یہ نظام ہے! — ادارہ

بیانُ القُرآن ——— 9

سورۃ الاحزاب (آیات ۲۱ تا ۳۵) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

فِیهِ ذِکرُکُم ——— 29

حکایتِ فسادِ بنی اسرائیل — ڈاکٹر صہیب حسن

مطالعہ قرآن حکیم (۲) ——— 47

لوازمِ نجات: سورۃ العصر کی روشنی میں — شجاع الدین شیخ

گوشۂ خواتین ——— 58

مثالی خاتون — عاتکہ علاؤالدین

اصولِ دین ——— 70

مقامِ حدیث — عبدالرشید عراقی

آدابِ معاشرت ——— 87

اولاد کی تربیت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

ظرف و احوال ——— 91

دہشت گردی کا مذہب — محمد ندیم پشاوری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زینب کا قاتل یہ نظام ہے!

قصور میں ۳۰۰ بچوں کے ساتھ زیادتی کے گھناؤنے انکشاف کے بعد ابھی تک قوم کے شرم سے جھکے سر اُٹھے نہیں تھے کہ ایک اور اندوہناک واقعہ نے پوری قوم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ سات سالہ زینب کے ساتھ جس درندگی اور بہیمیت کا مظاہرہ ہوا اُس پر اُس کے والدین پر جو قیامت گزری اس کا دکھ اور کرب سینے میں دل رکھنے والا ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ پوری قوم اس المناک واقعہ پر سوگوار ہے۔ اس واقعہ کے بعد عوام کا دکھ' کرب اور اضطراب اس لیے بھی بڑھ گیا ہے کہ یہ اس طرح کا کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے بلکہ پولیس رپورٹس اور مختلف تنظیموں کے ریکارڈ کے مطابق گزرے سال کے صرف چھ ابتدائی ماہ میں بچوں کے ساتھ زیادتی کے ۶۸۷ واقعات ہوئے' جن میں سے ۶۸ واقعات صرف ضلع قصور میں ہوئے ہیں۔ اس سے قبل قصور ہی میں تقریباً ۳۰۰ بچوں کے ساتھ زیادتی کا معاملہ سامنے آیا تھا جنہیں نشہ آور ٹیکے لگا کر اور ادویات کھلا کر زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا تھا اور ان کی فحش ویڈیوز بنا کر انٹرنیٹ پر اَپ لوڈ کی جاتی تھیں۔ واقعات جب میڈیا میں آئے تو انتظامیہ جاگی۔ معاملہ ایوانِ بالا تک پہنچا۔ پولیس متحرک ہوئی' درجنوں سی ڈیز اور فوٹو کلپس برآمد ہوئے۔ انکوائری ہوئی' فوری انصاف فراہم کرنے اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بلند و بانگ دعوے کیے گئے۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ قوم اس اندوہناک سانحہ کو بھول گئی اور ملزمان بھی رہا ہو گئے۔ اتنے بڑے واقعہ کا اصل ذمہ دار کون تھا؟ کون اس ابلیسی کھیل کو مسلمانوں کے معاشرہ میں رچا رہا تھا؟ کون کون ملوث تھا؟ کس کس کے مفادات اس ابلیسی دھندے سے وابستہ تھے' آج تک قوم کے سامنے یہ بات نہ آ سکی۔ زینب کیس کے بعد بھی حکومت اور مختلف اداروں کی طرف سے بڑے بڑے دعوے کیے گئے' جے آئی ٹی بنی' ملزم کو گرفتار کرنے کے کئی بار دعوے سامنے آئے۔ مگر اس کے باوجود کہ کئی واضح اور صاف سی سی ٹی وی فوٹیج میڈیا میں گردش کرتے رہے ابھی تک جو کچھ ہوا وہ بھی قوم کے سامنے ہے۔ پولیس ریکارڈ اور مختلف تنظیموں کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ملک میں اوسطاً ہر روز گیارہ معصوم بچے جنسی درندگی کا شکار بنتے ہیں' جن میں سب سے زیادہ تعداد پنجاب کی ہے' جہاں ہر روز بچوں اور خواتین کو جنسی زیادتی کا

نشانہ بنانے کے ۴ سے ۵ واقعات ہو رہے ہیں اور ملزموں کو پکڑنے کی شرح ۲۰ فیصد سے بھی کم ہے۔

یہ سب کچھ اس ملک میں ہو رہا ہے جو اسلام کے نام پر بنا تھا اور یہ سب اس قوم کے بچے ہیں جس نے اس نعرے اور اس دعوے پر اپنے گھر بار چھوڑے' عصمتیں لٹائیں اور ہر طرح کی جان و مال کی قربانیاں دیں کہ یہاں اسلامی معاشرے کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ ''پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ'' ان کا نعرہ اور دو قومی نظریہ ان کا نظریہ تھا کہ ہندو مشرک' غاصب اور متعصب ہیں' ہمارا ان کے ساتھ گزارا نہیں ہوتا' لہٰذا ہم اپنا ایک الگ وطن بنائیں گے کہ جہاں ہماری نسلیں قرآن و سنت کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کے لختِ جگر یہاں اس قدر مکروہ ترین ابلیسی کھلواڑ کا شکار بنیں گے جس کا تصور کسی بگڑے سے بگڑے ہوئے معاشرے میں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ہماری نسل کے ایک باعزت گھر کے بزرگ عمرہ کی ادائیگی کے لیے مقدس سرزمین پر پہنچیں گے تو انہیں وہاں ایک ایسی خبر ملے گی جس کی وہ اس معاشرے میں توقع بھی نہیں کر سکتے تھے جس کے لیے ان کے بزرگوں نے قربانیاں دی تھیں۔ انہیں کیا خبر تھی انہی کی نسل کی ایک بچی گھر سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے نکلے گی مگر اس کے ساتھ درندگی' سفاکیت اور ابلیسیت کا ایسا مکروہ ترین کھیل کھیلا جائے گا جس سے انسانیت شرما جائے گی اور انسان کا اسفل سافلین ہونا ابھر کر سامنے آئے گا۔ آج قیام پاکستان کے لیے قربانیاں دینے والوں کی روحیں بھی کتنی شرمسار ہوں گی۔

ہمارا آئیڈیل نظام تو وہ نظامِ عدلِ اجتماعی تھا جس میں اکیلی عورت ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کرے مگر اُسے کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کرے' جہاں زکوٰۃ دینے والا گلی گلی خوار ہوتا پھرے مگر اسے کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ ملے۔ مگر ایسا کیا ہوا کہ آج ہم ایک ایسے نظام کی دلدل میں پھنس گئے جہاں ہماری عزت' جان و مال تک محفوظ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ معصوم بچوں کی زندگیاں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ جہاں خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی تعداد میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے' اس سے چار گنا تیزی سے حکمرانوں کی آف شور کمپنیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ جہاں انسانیت ناپید ہے' جہاں معصوم اور بے گناہ لوگوں کی عزتوں اور عصمتوں کو بھی کاروبار بنا لیا گیا ہے۔ جہاں خدا خوفی' تقویٰ' پرہیزگاری کا نام تک نہیں۔ جہاں ابلیس ننگا ناچ رہا ہے۔ ہر نئی صبح ہمارے بھٹکے ہونے کی وعید سنا رہی ہے' ہر چڑھتا سورج ہمیں اصل راستے کی کھوج لگانے کی تلقین کر رہا ہے' ہر دن روح کو چھلنی کر دینے والا کوئی نہ کوئی واقعہ ہمیں سمجھ جانے اور ہر دن ایک نئی ٹھوکر ہمیں سیدھے راستے پر چلنے کی تاکید کر رہی ہے' مگر ہم ہیں کہ نہ ذرا ٹھہر کر سوچتے ہیں' نہ بھٹکنے کا احساس ہے اور نہ ہی انجام کی فکر ہے۔

آج زینب کا اندوہناک قتل جہاں قاتلوں کی عبرتناک سزا کا تقاضا کرتا ہے وہاں کیا اس بات کا

تقاضا نہیں کرتا کہ ہم بحیثیت قوم کچھ دیر رُک کر سوچیں کہ ہماری منزل کہاں تھی اور کہاں پہنچ گئے ہیں؟ یہ سب ہمارے ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟ کیا یہی ہمارے آباء واجداد کی قربانیوں کا ثمر ہے؟ کیا اس لیے یہ ملک آزاد ہوا تھا؟ کیا اسی لیے ہم نے اپنے جوانوں کی گردنیں کٹوائی تھیں؟ کیا اسی لیے ہم نے اپنی جوان عزتوں کو جیتے جی کنوؤں کی نذر کیا تھا؟ کون ہے جو ہمیں اس تباہی کے دہانے پر لے آیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جنہیں ہم راہبر سمجھ بیٹھے تھے وہی راہزن نکلے ہیں؟ ٹھوکر پر ٹھوکر لگنے کے باوجود ہم نہ یہ سب جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی یہ سوچتے ہیں کہ اس کا مستقل اور دائمی حل کیا ہونا چاہیے۔ بس دو چار مذمتی بیانات' پریس کانفرنسیں' صفائیاں' الزامات اور بس! سیاسی جماعتوں کا ایجنڈا زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ واقعہ کو اپنے سیاسی مفادات کے لیے استعمال کیا جائے۔ اپوزیشن میں ہیں تو حکومت کی نااہلی قرار دے دو' حکومت میں ہیں تو حکومت کے خلاف سازش قرار دے دو۔ این جی اوز اور سماجی تنظیمیں اپنا اپنا ایجنڈا لے کر سامنے آجاتی ہیں کہ بچوں کو جنسی تعلیم دو۔ سیکولر لبرل عناصر کا ایجنڈا تو اس سے بھی اوپر کا ہے کہ معاشرے میں جنسی آزادی ہو۔ میڈیا سفارشی بھرتیوں کو خرابی کی وجہ قرار دیتا ہے۔ دانشور زیادہ سے زیادہ نظام کی خرابی کی بات کہہ دیتے ہیں' مگر اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک میں کوئی ایسا نہیں ہے جو یہ کہے کہ اللہ کی عطا کی ہوئی اس سرزمین پر اللہ ہی کا دیا ہوا نظام نافذ کرو تاکہ عدل وانصاف قائم ہو۔

چنانچہ حقیقت صاف طور پر واضح ہے کہ وہ نظام جو عدل وانصاف پر مبنی فطری نظام ہے' جو نہ صرف انسانوں کی جان' مال اور عزت کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے بلکہ انسانوں کی اخلاقی و روحانی تربیت بھی کرتا ہے' جو انسان کے اندر موجود حیوان کو لگام ڈال کر انسان کو اشرف المخلوقات بناتا ہے' اتنی ٹھوکریں کھانے کے باوجود بھی ہم اس فطری نظام کو اپنانے اور قائم کرنے کے لیے تیار نہیں' بلکہ آسمانِ مغرب سے آنے والی ہر ''وحی'' پر فوراً لپک کر جاتے ہیں کہ عورتوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دو' انہیں گھروں سے باہر نکالو' بچوں کو جنسی تعلیم سے آراستہ کرو۔ اقبال نے کیا خوب کہا تھا ؎

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ!

ہمارے ہاں جنسی تعلق کے لیے نکاح شرطِ لازم ہے اور کچھ مشرقی روایات کی پاسداری بھی ہے۔ شرم وحیا کے تقاضے بھی ہیں۔ مغرب میں معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ وہاں تو کھلی آزادی ہے' ننگ دھڑنگ معاشرہ ہے۔ وہاں کے اصولوں کو اگر یہاں اپنانے کی کوشش کی جائے گی تو اس کا لازمی نتیجہ وہی نکلے گا جو نکل رہا ہے۔ خود مغرب میں عورت کو جتنی آزادی حاصل ہے' کیا اس کے

باوجود وہاں کی عورت محفوظ ہے؟ کیا بچوں کو جنسی تعلیم دینے سے زیادتی کی شرح کم ہوئی؟ بلکہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مغرب ایسے واقعات میں سب سے آگے ہے۔ اس کے باوجود اگر ہمارے حکمت و دانش کے جادوگر مغرب سے ہی دوا لینے جاتے ہیں تو انہیں کم از کم اب سمجھ لینا چاہیے کہ اس سے ہمارا درد ہرگز ختم نہیں ہوگا بلکہ ہم مزید شیطنت' حیوانیت اور ابلیسیت کے دلدل میں پھنستے چلے جائیں گے۔ مغربی نظام کے لیے ہم نے اپنا وہ نظام چھوڑا جس کے لیے یہ ملک بنایا تھا' مغربی اصولوں کے لیے اپنے اصول چھوڑے' اپنی روایات کو چھوڑا' اپنی اقدار کو چھوڑا' مگر ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''۔ عورتوں کی آزادی اور حقوق کا جتنا غلغلہ این جی اوز نے اٹھایا ہے طلاقوں کی شرح اتنی ہی بڑھ گئی ہے۔ میڈیا کو جتنی آزادی ملی فحاشی اور عریانی اتنی ہی تیزی سے پھیلی۔ یہی میڈیا جو ایسے واقعات پر شور مچاتا ہے معاشرے میں جنسی اشتعال پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ نتیجتاً آج نہ اقدار ہماری اپنی ہیں' نہ روایات اپنی ہیں' نہ ہمارا خاندانی نظام محفوظ ہے' نہ عورتوں کی عزتیں محفوظ ہیں' حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اب قوم کے پھول جیسے معصوم بچے اور بچیاں ہوس اور درندگی کا نشانہ بننے لگے ہیں۔ چنانچہ یہ زینب کا قتل نہیں بلکہ ہماری اقدار کا قتل ہے' ہماری روایات کا قتل' ہمارے نظریات کا قتل ہے' اور ان سب کا قاتل وہ شیطانی نظام ہے جو ایک طرف فحاشی وعریانی کو فروغ دیتا ہے اور دوسری طرف نکاح کو مشکل بناتا ہے۔ جو عورتوں کو گھروں سے نکال کر چوک چوراہوں پر ان کی نمائش کرتا ہے' جو غریب کو غریب تر اور امیر کو امیر تر بناتا ہے' جو انسان کی اخلاقی و روحانی خاصیت کو مسخ کر کے اسے دنیا پرستی کی ترغیب دیتا ہے' جو انسانوں کو اشرف المخلوقات کے مقام ومرتبے سے اُتار کر حیوانیت کی سطح سے بھی گرا دیتا ہے۔

آیئے! ایسے باطل' دجالی' استحصالی نظام پر لعنت بھیج کر اپنے اصل کی طرف لوٹ آئیں اور اس فطری اور حقیقی نظام کو اپنے معاشرے میں قائم کریں جس کے لیے ہم نے یہ ملک بنایا تھا۔ جو قائداعظم اور اقبال کا خواب تھا۔ آیئے' اب بھی وقت ہے کہ ہم لوٹ جائیں اس راستے کی طرف جو رحمتوں' کامیابیوں اور کامرانیوں کا راستہ ہے' کیونکہ وہی ایک راستہ ہے جو رحمۃ للعالمین ﷺ کا بتایا ہوا راستہ ہے۔

❁❁❁

میثاق 'حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن تنظیم کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الاَحزَاب

آیات ۲۱ تا ۲۷

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ
الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا
وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا
وَّتَسْلِيْمًا ۝ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ
مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۡ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ
الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ
وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۝ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ
ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ
فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۝ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ
وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝

جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے‘ غزوۂ احزاب کا واقعہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی‘ جس کا مقصد کھرے اور کھوٹے کو پرکھنا تھا۔ چنانچہ اس آزمائش کے نتیجے میں انسانی کردار کی دو تصاویر سامنے آئیں۔ ایک اندھیرے کی تصویر تھی اور دوسری اُجالے کی۔ ان میں سے اندھیرے کی تصویر کا تذکرہ گزشتہ آیات میں ہوا جبکہ دوسری تصویر کی جھلک آئندہ آیات میں دکھائی جا رہی ہے۔ اجالے کی اس تصویر میں خورشید عالم تاب کی علامت چونکہ حضور ﷺ کا کردار ہے اس لیے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا:

آیت ۲۱ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ’’(اے مسلمانو!) تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے‘‘

بظاہر ہمارے ہاں اس آیت کی تفہیم و تعلیم بہت عام ہے۔ سیرت کا کوئی سیمینار ہو‘ میلاد کی کوئی محفل ہو یا کسی واعظِ رنگین بیان کا وعظ ہو‘ اس آیت کی تلاوت لازمی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے سیرت و کردار کا نمونہ اپنانے کی جو صورت آج مسلمانوں کے ہاں عموماً دیکھنے میں آتی ہے اس کا تصور بہت محدود نوعیت کا ہے اور جن سنتوں کا تذکرہ عام طور پر ہمارے ہاں کیا جاتا ہے وہ محض روزمرہ کے معمولات کی سنتیں ہیں‘ جیسے مسواک کی سنت یا مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دایاں پاؤں اندر رکھنے اور باہر نکلتے ہوئے بایاں پاؤں باہر رکھنے کی سنت۔ یقیناً ان سنتوں کو اپنانے کا بھی ہمیں اہتمام کرنا چاہیے اور ہمارے لیے حضور ﷺ کی ہر سنت یقیناً منبع خیر و برکت ہے۔ لیکن اس آیت کے سیاق و سباق کو مدنظر رکھ کر غور کریں تو یہ نکتہ بہت آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا کہ یہاں جس اُسوہ کا ذکر ہوا ہے وہ طاقت کے نشے میں بدمست باطل کے سامنے بے سروسامانی کے عالم میں جان ہتھیلی پر رکھ کر ڈٹ جانے کا اُسوہ ہے۔ اور اُسوۂ رسول ﷺ کا یہی وہ پہلو ہے جو آج ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ دراصل اس آیت میں خصوصی طور پر حضور ﷺ کے اس کردار کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے جس کا نظارہ چشمِ فلک نے غزوۂ خندق کے مختلف مراحل کے دوران کیا۔ اس دوران اگر کسی مرحلے پر فاقوں سے مجبور صحابہؓ نے بھوک کی شکایت کی اور اپنے پیٹوں پر پتھر بندھے ہوئے دکھائے تو حضور ﷺ نے بھی اپنی قمیص اٹھا کر اپنا پیٹ دکھایا جہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ اُس وقت اگر صحابہؓ خندق کی کھدائی میں لگے ہوئے تھے تو ان کے درمیان حضور ﷺ خود بھی بڑے بڑے پتھر اپنے کندھوں پر اُٹھا اُٹھا کر باہر پھینکنے میں مصروف تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کوئی سنگلاخ چٹان صحابہؓ کی ضربوں سے ٹوٹ نہ سکی اور حضور ﷺ کو اطلاع دی گئی تو آپؐ نے بنفسِ نفیس اپنے ہاتھوں سے ضرب لگا کر اسے پاش پاش کیا۔ اس مشکل گھڑی میں ایسا نہیں تھا کہ حضور ﷺ کے لیے پرآسائش خیمہ نصب کر دیا گیا ہو‘ آپؐ اس میں محوِ استراحت ہوں‘ خُدّام مورچھل لیے آپؐ کی خدمت کو موجود ہوں اور باقی لوگ خندق کھودنے میں لگے ہوئے ہوں۔

حضور ﷺ کے اُسوہ اور آپؐ کی سنت کو عملی طور پر اپنائے جانے کے معاملے کو سمجھانے کے لیے عام طور پر میں معاشیات کی دو اصطلاحات macro economics اور micro

economics کی مثال دیا کرتا ہوں۔ یعنی جس طرح macro economics کا تعلق بہت بڑی سطح کے معاشی منصوبوں یا کسی ملک کے معاشی نظام کے مجموعی خدوخال سے ہے‘ اور چھوٹے پیمانے پر معمول کی معاشی سرگرمیوں کے مطالعے کے لیے micro economics کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے‘ اسی طرح اگر ہم macro sunnah اور micro sunnah کی اصطلاحات استعمال کریں اور اس حوالے سے اپنا اور اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ آج ہماری اکثریت ’’مائیکرو سنت‘‘ سے تو خوب واقف ہے‘ اکثر لوگ روزمرہ معمول کی سنتوں پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں‘ بلکہ بعض اوقات جذبات کی رو میں بہہ کر اس بنا پر دوسروں کے ساتھ جھگڑے بھی مول لیتے ہیں‘ لیکن ’’میکرو سنت‘‘ کی اہمیت وضرورت کا کسی کو ادراک ہے اور نہ ہی اس کی تعمیل کی فکر (اِلاَّ مَا شَاءَ اللّٰہ)۔ مثلاً حضور ﷺ کی سب سے بڑی (macro) سنت تو یہ ہے کہ وحی کے آغاز یعنی اپنی چالیس سال کی عمر کے بعد آپؐ نے اپنی پوری زندگی میں کوئی ایک لمحہ بھی معاشی جدوجہد کے لیے صرف نہیں کیا اور نہ ہی اپنی زندگی میں آپؐ نے کوئی جائیداد بنائی۔ بعثت سے پہلے آپؐ ایک خوشحال اور کامیاب تاجر تھے‘ لیکن سورۃ المدثر کی ان آیات کے نزول کے بعد آپؐ کی زندگی یکسر بدل گئی: ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ ’’اے چادر اوڑھنے والے! اُٹھیے‘ اور (لوگوں کو) خبردار کیجیے‘ اور اپنے رب کی تکبیر کیجیے‘‘۔ اس حکم کی تعمیل میں گویا آپؐ نے اپنی ہر مصروفیت کو ترک کر دیا‘ ہر قسم کی معاشی جدوجہد سے پہلوتہی اختیار فرمائی‘ اور اپنی پوری قوت وتوانائی‘ تمام تر اوقات اور تمام تر تگ ودَو کا رخ دعوتِ دین‘ اقامتِ دین اور تکبیرِ رب کی طرف پھیر دیا۔ یہ وہ ’’میکرو سنت‘‘ ہے جس سے نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی خالی نظر نہیں آتا۔

آج اس درجے میں نہ سہی مگر اس میکرو سنت کے رنگ کی کچھ نہ کچھ جھلک تو بحیثیت مسلمان ہماری زندگیوں میں نظر آنی چاہیے‘ اور اس رنگ کے ساتھ ساتھ مائیکرو قسم کی سنتوں کا بھی اہتمام کیا جائے تو وہ یقیناً نورٌ علیٰ نور والی کیفیت ہوگی۔ لیکن اگر ہم اپنی ساری توانائیاں صرف چھوٹی چھوٹی سنتوں کے اہتمام میں ہی صرف کرتے رہیں‘ برش کے بجائے مسواک کا استعمال کر کے سو شہیدوں کے برابر ثواب کی امید بھی رکھیں اور اتباعِ سنت کے اشتہار کے طور پر ہر وقت مسواک اپنی جیب میں بھی لیے پھریں‘ لیکن اپنی زندگیوں کا عمومی رخ متعین کرنے

میں ’’میکرو سنت‘‘ کا بالکل بھی لحاظ نہ کریں تو ہمیں خود فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہمارا یہ طرزِ عمل اُسوۂ رسول ﷺ سے کس قدر مطابقت اور مناسبت رکھتا ہے!

﴿لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ﴾ ’’(یہ اُسوہ ہے) ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ سے ملاقات اور آخرت کی امید رکھتا ہو‘‘

﴿وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝۲۱﴾ ’’اور کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتا ہو۔‘‘

یعنی حضور ﷺ کا اسوہ صرف اس شخص کے لیے ہے جو ان تین شرائط کو پورا کرے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا متمنی ہو‘ یعنی اللہ سے محبت کرتا ہو۔ دوسری شرط یہ کہ وہ شخص یومِ آخرت کی بھی امید رکھتا ہو‘ یعنی بعث بعد الموت پر اس کا یقین ہو۔ اور تیسری شرط یہ کہ وہ اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرتا ہو۔ گویا ہر وقت اللہ کو یاد رکھتا ہو۔

رسول اللہ ﷺ کے اُسوہ کے حوالے سے ان شرائط کے فلسفے کو سورۃ البقرۃ کی آیت ۲ اور آیت ۱۸۵ کی روشنی میں سمجھئے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۵ میں قرآن کو هُدًى لِّلنَّاسِ (تمام نوعِ انسانی کے لیے ہدایت) قرار دیا گیا ہے۔ لیکن آیت ۲ میں اس ہدایت سے استفادہ کو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کی شرط سے مشروط کر دیا گیا ہے کہ قرآن سے صرف وہی لوگ ہدایت حاصل کر سکتے ہیں جو تقویٰ کی روش پر کاربند ہیں۔ اس اصول کی روشنی میں آیت زیرِ مطالعہ کا مفہوم یہ ہے کہ حضور ﷺ کا اُسوہ تو اپنی جگہ کامل واکمل اور منبعِ رشد وہدایت ہے لیکن اس سے استفادہ صرف وہی لوگ کر سکیں گے جو اِن تین شرائط پر پورا اترتے ہوں۔

حضور ﷺ کے اُسوہ کے ذکر کے بعد آگے آپؐ کے صحابہؓ کے کردار کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہ گویا وہی ترتیب ہے جو سورۃ الفتح کی آخری آیت میں آئی ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ .....﴾ ’’محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں‘ اور وہ لوگ جو آپؐ کے ساتھ ہیں.....‘‘ یعنی پہلے حضور ﷺ کا ذکر اور پھر اس کے بعد آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا۔

آیت ۲۲ ﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ﴾ ’’اور جب اہلِ ایمان نے دیکھا ان لشکروں کو‘‘

﴿قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ﴾ ’’تو انہوں نے کہا کہ یہی تو ہے جس کا ہم سے وعدہ کیا تھا اللہ اور اُس کے رسولؐ نے‘ اور بالکل سچ فرمایا تھا اللہ اور اُس کے رسولؐ نے۔‘‘

ان کے دلوں نے فوراً ہی گواہی دے دی کہ یہ وہی صورت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے ہمیں ان الفاظ میں متنبہ کر دیا تھا: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ﴾ (البقرۃ:۱۵۵) ’’اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے‘ اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کے نقصان سے۔‘‘ بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے تو ہمیں یہاں تک خبردار کر دیا تھا: ﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۡ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ﴾ (آل عمران:۱۸۶) ’’(مسلمانو یاد رکھو!) تمہیں لازماً آزمایا جائے گا تمہارے مالوں میں بھی اور تمہاری جانوں میں بھی‘ اور تمہیں لازماً سننا پڑیں گی بڑی تکلیف دہ باتیں‘ ان لوگوں سے بھی جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور مشرکین سے بھی۔‘‘

یہاں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ محاصرے کی جس صورتِ حال پر منافقین نے ﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ⑫﴾ کے الفاظ میں تبصرہ کیا تھا اسی صورت حال پر مؤمنین کا تبصرہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ یعنی ایک ہی صورتِ حال میں دونوں فریقوں کا ردعمل مختلف بلکہ متضاد تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی انسان کے عمل اور اس کے رویّے کا انحصار اس کے دل کی کیفیت پر ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶ میں قرآن کریم کے حوالے سے یوں واضح کیا گیا ہے: ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت عطا کرتا ہے۔

﴿وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ⑫﴾ ’’اور اس (واقعہ) نے ان میں کسی بھی شے کا اضافہ نہیں کیا مگر ایمان اور فرمانبرداری کا۔‘‘

یعنی یہ آزمائش مسلمانوں کے ایمان اور جذبۂ تسلیم و رضا میں مزید اضافہ کر گئی۔ محاصرے کے پورے عرصے کے دوران میں ہر قسم کی مصیبت اور پریشانی کے سامنے وہ ع ’’سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے‘‘ کے نعرۂ مستانہ کی عملی تصویر بنے رہے۔ گویا مؤمن تو ہر حال میں خوش اور مطمئن رہتا ہے۔ اللہ کے راستے میں اس کی کوششیں دنیا میں ہی بارآور ہوں یا اس جدوجہد میں اس کی جان چلی جائے‘ وہ دونوں صورتوں میں سرخرو ٹھہرتا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۵۲ میں ان دونوں صورتوں کو اَلْحُسْنَيَيْنِ (دو بھلائیاں) قرار دیا گیا ہے: ﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ﴾ ’’(اے مسلمانو! ان منافقین سے) کہو کہ تم ہمارے

بارے میں کس شے کا انتظار کر سکتے ہو؟ سوائے دو بھلائیوں میں سے ایک کے!‘‘ یعنی تبوک کی اس مہم کے دوران میں جو صورت بھی ہمارے درپیش ہو ہمارے لیے اس میں بھلائی ہی بھلائی ہے۔ اگر فتح یاب ہو کر لوٹے تو دنیا کی کامیابیاں پائیں گے اور اگر شہید ہو گئے تو جنت کی ابدی نعمتوں سے نوازے جائیں گے۔ (سورۃ التوبہ ۹ ہجری میں سورۃ الاحزاب کے چار سال بعد نازل ہوئی۔)

یہ راستہ دراصل عشق کا راستہ ہے اور اس راستے کے مسافروں کی نظر ظاہری مفاد کے بجائے اپنے محبوب کی رضا پر ہوتی ہے۔ حالات موافق و سازگار ہوں یا مخدوش و نامساعد‘ وہ اس کی پروا کیے بغیر اپنے محبوب کی خوشنودی کے لیے سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ بقول غالب:

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی!

آیت ۲۳ ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ﴾ ’’اہلِ ایمان میں وہ جواں مرد لوگ بھی ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا وہ عہد جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا۔‘‘

انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے مال اور ہماری جانیں اللہ کی راہ میں قربانی کے لیے حاضر ہیں اور انہوں نے اپنا یہ دعویٰ عملی طور پر سچ کر دکھایا۔

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ ﴾ ’’پس ان میں سے کچھ تو اپنی نذر پوری کر چکے‘‘

یہ اشارہ ہے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف جو ان آیات کے نزول (۵ ہجری) سے پہلے جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ مثلاً غزوۂ بدر میں چودہ (۱۴)‘ جبکہ غزوۂ اُحد میں ستر (۷۰) صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تھے۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۡ﴾ ’’اور ان میں سے کچھ انتظار کر رہے ہیں۔‘‘

باقی منتظر ہیں کہ کب ان کی باری آئے‘ انہیں جان قربان کرنے کا موقع میسر آئے اور وہ اللہ کے حضور سرخرو ہوں:

وبالِ دوش ہے سر جسمِ ناتواں پہ مگر
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لیے!

﴿وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ⑬﴾ ’’اور انہوں نے ہرگز کوئی تبدیلی نہیں کی۔‘‘

اللہ سے جو عہد انہوں نے پہلے دن سے کر رکھا ہے آج بھی وہ اس پر قائم ہیں اور اس میں

انہوں نے سرِموفرق نہیں آنے دیا۔

آیت ۲۴ ﴿لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ﴾ ’’تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا پورا پورا بدلہ دے‘‘

﴿وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ ’’اور منافقین کو چاہے تو عذاب دے اور چاہے تو ان کی توبہ قبول کر لے۔‘‘

یعنی اللہ چاہے تو ان کو توبہ کا موقع دے دے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۲۴﴾ ’’یقیناً اللہ بہت بخشنے والا‘ نہایت رحم کرنے والا ہے۔‘‘

اس آیت سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اُس وقت (۵ ہجری) تک منافقین کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن جب یہ مہلت ختم ہوگئی تو ان کے متعلق یہ فیصلہ سنا دیا گیا: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝۱۴۵﴾ (النساء) ’’یقیناً منافقین آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے‘ اور تم نہ پاؤ گے ان کے لیے کوئی مددگار۔‘‘ بلکہ غزوۂ تبوک کی مہم کے دوران ان کے کردار اور رویّے کے سبب سورۃ التوبہ میں ان کے بارے میں آخری فیصلہ بایں الفاظ فرما دیا گیا: ﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۸۰﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ ان کے لیے استغفار کریں یا ان کے لیے استغفار نہ کریں (ان کے حق میں برابر ہے)‘ اگر آپ ستّر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کریں گے تب بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں فرمائے گا۔ یہ اس لیے کہ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کر چکے ہیں‘ اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

آیت ۲۵ ﴿وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ﴾ ’’اور لوٹا دیا اللہ نے کافروں کو ان کے غصے کے ساتھ ہی‘‘

کفار و مشرکین بہت بڑا لشکر اکٹھا کر کے فتح کے زعم میں مدینہ پر حملہ آور ہوئے تھے‘ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ناکام و نامراد پسپا کر دیا۔ نہ تو جنگ کی نوبت آئی اور نہ ہی وہ اپنا ہدف حاصل کر سکے۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غصے کی جو آگ بھڑک رہی تھی اسے بھی ٹھنڈا کرنے کا انہیں موقع نہ ملا اور اپنے غیظ و غضب سمیت ہی انہیں بے نیلِ مرام واپس جانا پڑا۔

﴿لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ﴾ ’’وہ کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔‘‘

اس مہم میں انہیں ناکامی و حسرت کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔ نہ تو وہ کسی قسم کا کوئی کارنامہ سرانجام دے سکے اور نہ ہی کوئی مفاد حاصل کر سکے۔

﴿وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ﴾ ’’اور اللہ کافی رہا اہلِ ایمان کی طرف سے قتال کے لیے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے کھلی جنگ کی نوبت ہی نہ آنے دی اور اپنی تدابیر اور اپنے لشکروں کے ذریعے سے ہی کفار کو شکست دے دی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ایک کڑے امتحان سے تو گزارا مگر انہیں کوئی گزند نہ پہنچنے دی۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۝۲۵﴾ ’’اور یقیناً اللہ بڑی طاقت والا‘ سب پر غالب ہے۔‘‘

اب آئندہ آیات میں غزوۂ بنی قریظہ کا ذکر ہے۔ یہ غزوہ گویا غزوۂ احزاب کا ضمیمہ ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب کفار کے لشکر چلے گئے اور نبی اکرم ﷺ خندق سے پلٹ کر گھر تشریف لائے اور اپنی زرہ اور ہتھیار اتارے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! آپؐ نے ہتھیار اتار دیے ہیں‘ جبکہ ہم نے تو ابھی نہیں اتارے! اس لیے کہ ابھی بنی قریظہ کو ان کی بدعہدی کی سزا دینا باقی ہے۔ یہ ظہر کا وقت تھا۔ حضور ﷺ نے فوراً اعلان فرمایا کہ ’’جو کوئی سمع و طاعت پر قائم ہو وہ عصر کی نماز اُس وقت تک نہ پڑھے جب تک دیارِ بنی قریظہ پر نہ پہنچ جائے!‘‘ ساتھ ہی آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک دستے کے ساتھ مقدمۃ الجیش کے طور پر بنو قریظہ کی طرف روانہ فرما دیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد حضور ﷺ کی قیادت میں پورا اسلامی لشکر وہاں پہنچ گیا اور ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا۔ یہ اپنے مضبوط قلعوں اور گڑھیوں میں محصور ہو گئے۔ دو تین ہفتوں کے محاصرے کے بعد بالآخر یہودیوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کے بارے میں جو فیصلہ کریں گے وہ انہیں قبول ہوگا۔ حضرت سعدؓ بن معاذ قبیلہ اوس کے رئیس تھے اور قبیلہ اوس کے ساتھ ماضی میں بنی قریظہ کے حلیفانہ تعلقات رہ چکے تھے۔ اس لیے بنی قریظہ کو امید تھی کہ وہ ان کے حق میں نرم فیصلہ کریں گے اور انہیں بھی اسی طرح مدینہ سے نکل جانے دیں گے جس طرح قبل ازیں بنو قینقاع اور بنو نضیر کو نکل جانے دیا گیا تھا۔ لیکن حضرت سعدؓ دیکھ چکے تھے کہ پہلے جن دو یہودی قبیلوں کو مدینہ سے نکل جانے کا موقع دیا گیا تھا وہ کس طرح سارے گرد و پیش کے قبائل کو بھڑکا کر مدینہ پر بارہ

ہزار کا لشکر چڑھا لائے تھے۔ اور یہ معاملہ بھی حضرت سعدؓ کے سامنے تھا کہ بنوقریظہ نے عین بیرونی حملے کے موقع پر بدعہدی کر کے مسلمانوں کی تباہی کا سامان کیا تھا۔ چنانچہ حضرت سعدؓ نے تورات کے احکام کے عین مطابق فیصلہ سنایا اور تورات میں بدعہدی کی جو سزا تھی وہی سزا ان کے لیے تجویز کی۔ اس فیصلے کے مطابق بنی قریظہ کے ان تمام مَردوں کو قتل کر دیا گیا جو جنگ کے قابل تھے۔ عورتوں‘ بچوں اور بوڑھوں کو غلام بنا لیا گیا اور ان کے اموال و املاک پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس طرح مدینہ سے اس آخری یہودی قبیلے کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس سے پہلے دو یہودی قبائل (بنوقینقاع اور بنونضیر) کو بدعہدی ہی کی سزا کے طور پر مدینہ سے جلاوطن کیا جا چکا تھا۔ بہرحال ان تینوں قبائل میں سے بنی قریظہ کو بدترین سزا کا سامنا کرنا پڑا۔ جب مسلمان بنوقریظہ کی گڑھیوں میں داخل ہوئے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان غداروں نے جنگ احزاب میں حصہ لینے کے لیے بہت بڑی تعداد میں تلواریں‘ نیزے‘ ڈھالیں اور زرہیں تیار رکھی تھیں۔

آیت ۲۶ ﴿وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ﴾ ’’اور اللہ نے اُتار لیا اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے ان (مشرکین) کی مدد کی تھی‘ ان کے قلعوں سے‘‘

بنوقریظہ کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے مسلمانوں سے بدعہدی کر کے حملہ آور قبائل کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ چنانچہ اللہ کی مشیت کے مطابق انہیں اپنے قلعوں اور گڑھیوں سے نکل کر مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے۔

﴿وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ ’’اور ان کے دلوں میں اُس نے رعب ڈال دیا‘‘

﴿فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۝۲۶﴾ ’’تو اب ان میں سے کچھ کو تم قتل کر رہے ہو اور کچھ کو تم قیدی بنا رہے ہو۔‘‘

یعنی حضرت سعد بن معاذ ؓ کے فیصلے کے مطابق جنگ کے قابل مرد قتل کر دیے گئے‘ جبکہ بوڑھوں‘ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا گیا۔

آیت ۲۷ ﴿وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ﴾ ’’اور اُس نے تمہیں وارث بنا دیا ان کی زمینوں‘ ان کے گھروں اور ان کے اموال کا‘‘

﴿وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۭ﴾ ’’اور اُس زمین کا بھی جس پر ابھی تم نے قدم نہیں رکھے۔‘‘

اس فقرے میں ان تمام فتوحات کی طرف اشارہ موجود ہے جو بعد میں مسلمانوں کو حاصل ہوئیں۔ اس لحاظ سے غزوۂ احزاب حضور ﷺ کی جدوجہد کے سفر میں ایک فیصلہ کن موڑ (turning point) ثابت ہوا۔ اس سلسلے میں حضور ﷺ نے اہل ایمان کو خوشخبری بھی سنا دی تھی کہ: ((لَنْ تَغْزُوَكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) (۱) یعنی ’’اس سال کے بعد قریش کبھی بھی تم پر حملہ آور نہیں ہو سکیں گے‘ بلکہ آئندہ تم ان پر چڑھائی کرو گے۔‘‘

حضور ﷺ کے اس فرمان کی صداقت اگلے ہی سال یعنی ۶ ہجری میں اُس وقت ظاہر ہو گئی جب آپؐ چودہ سو صحابہؓ کے ساتھ عمرہ کرنے کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ اس سفر میں مسلمانوں نے احرام باندھ رکھے تھے۔ تلواروں کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور ہتھیار بھی نہیں تھا اور تلواریں بھی نیاموں میں تھیں۔ حضور ﷺ اپنے قافلے کے ساتھ جب مکہ کے قریب پہنچے تو یہ صورت حال گویا مشرکین مکہ کے گلے میں ایک ایسی ہڈی کی طرح پھنس کر رہ گئی جسے نہ وہ اُگل سکتے تھے اور نہ نگل سکتے تھے۔ ایک طرف ان کی صدیوں پرانی روایات تھیں جن کے مطابق کسی بدترین دشمن کو بھی حج یا عمرے سے روکا نہیں جا سکتا تھا اور دوسری طرف ان کی انا تھی جس کے تحت وہ مسلمانوں کو کسی قیمت پر بھی مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ ان کے لیے یہ دونوں صورتیں ہی مشکل تھیں۔ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکیں تو کس جواز کے تحت روکیں اور اگر آنے کی اجازت دیں تو کس منہ سے ایسا کریں!

اس صورتِ حال میں حضور ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ کرنے کا حکم دیا اور حضرت عثمان ؓ کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے مکہ بھیجا۔ حضرت عثمان ؓ کو مکہ میں کچھ زیادہ دیر رکنا پڑا تو مسلمان لشکر میں کسی طرح یہ افواہ پھیل گئی کہ مشرکین نے انہیں شہید کر دیا ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے آپؓ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے صحابہؓ سے بیعت لینے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ چنانچہ موقع پر موجود تمام صحابہؓ نے آپ ﷺ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر حضرت عثمان ؓ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے آخری دم تک لڑنے کا عہد کیا تھا۔ یہ بیعت علی الموت تھی اور تاریخ میں اسے ’’بیعتِ رضوان‘‘ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب اس بیعت کی خبر مکہ پہنچی تو مشرکین کے چھکے چھوٹ گئے۔ انہوں نے سفارتی مہم کے ذریعے حضور ﷺ کو صلح کی پیش کش کی اور طویل مذاکرات کے بعد بالآخر فریقین کے مابین صلح حدیبیہ کا تاریخی معاہدہ طے پا گیا۔ اس معاہدہ کے

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۳۹۶/۶

بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح میں بایں الفاظ تبصرہ فرمایا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴾ ''یقیناً ہم نے آپ ﷺ کو فتح مبین عطا فرمائی ہے۔''

اس فرمانِ الٰہی کے اثرات وثمرات فوری طور پر ہی ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ اگلے ہی سال ۷ ہجری میں مسلمانوں نے یہودیوں کا مضبوط گڑھ خیبر فتح کر لیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور بیس سال کے اندر اندر اسلامی سلطنت کی حدود تین براعظموں تک وسیع ہو گئیں۔ آیت زیر نظر میں انہی فتوحات کے بارے میں پیشین گوئی کی گئی ہے۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢٧﴾﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیات ۲۸ تا ۳۵

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿٢٨﴾ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٢٩﴾ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿٣٠﴾ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿٣١﴾ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاۗءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿٣٢﴾ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿٣٤﴾ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ

وَالصَّاۗىِٕمِيْنَ وَالصّٰۗىِٕمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٣٥﴾

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس رکوع کے مضمون کا ربط پہلے رکوع کے مضمون کے ساتھ ہے۔ دراصل یہ پورا مضمون معاشرتی اصلاحات سے متعلق ہے جس کی پہلی قسط کے طور پر کچھ احکام یہاں اس سورت میں بیان ہوئے ہیں جبکہ ان احکام کی دوسری قسط سورۃ النور میں ہے جو ایک سال بعد ۶ ہجری میں نازل ہوئی۔ ان اصلاحات میں عورتوں کے پردے کے بارے میں احکام بھی شامل ہیں۔ اس سے پہلے عرب میں عورتوں کے پردے کا رواج نہیں تھا۔ باہر نکلتے ہوئے عورتیں اگرچہ ایک بڑی سی چادر لپیٹ کر نکلتی تھیں لیکن وہ سر ڈھانپنے اور چہرہ چھپانے کا اہتمام نہیں کرتی تھیں۔ اسی طرح گھروں کے اندر بھی غیر محرم مردوں کا بے تکلف آنا جانا رہتا تھا اور گھر کی خواتین ان مردوں سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ چنانچہ اس معاملے میں تدریجاً اصلاحی احکام دیے گئے اور charity begins at home کے اصول کے مطابق پردے کے ابتدائی حکم میں سب سے پہلے حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو مخاطب کیا گیا۔

قبل ازیں آیت ۲۱ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ گویا ایک باپ کی حیثیت سے، ایک بیٹے کی حیثیت سے، داماد کی حیثیت سے، سسر کی حیثیت سے، قاضی القضاۃ کی حیثیت سے، سپہ سالار کی حیثیت سے، سربراہ مملکت کی حیثیت سے، امام، خطیب، معلّم، مربّی، مزکّی، غرض ہر قابل ذکر حیثیت سے آپ ﷺ کی ذات اور زندگی میں ایک کامل نمونہ ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ نمونہ مَردوں کے لیے ہے۔ مرد ہونے کی حیثیت سے آپ ﷺ کی زندگی میں عورتوں اور عورتوں کے نسوانی معاملات کے لیے تو مکمل نمونہ دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے عورتوں کی راہنمائی کے لیے ضروری تھا کہ کسی عورت کے کردار کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا۔ چنانچہ یہاں حضور ﷺ کے اُسوۂ مبارک کا ذکر فرمانے کے بعد حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو خصوصی طور پر مخاطب کر کے گویا ان کے کردار کو دنیا بھر کی عورتوں کے لیے اسوہ بنانا مقصود ہے۔ یعنی جس طرح حضور ﷺ کی ذات اُمت کے لیے اُسوہ ہے عین اسی طرح آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن خصوصی طور پر خواتینِ اُمت کے لیے مثال اور نمونہ ہیں۔ اسی بنا پر انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ اگر تم نیکی کرو گی تو دوگنا اجر پاؤ گی، اور

اگر (خدانخواستہ) تم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تو اس کی سزا بھی تمہیں دوگنا ملے گی۔ اس لیے کہ اب تم لوگوں کی زندگیاں دنیا بھر کی مسلمان خواتین کے لیے اُسوہ ہیں اور مسلمان خواتین کو رہتی دنیا تک تمہاری پیروی کرنا ہے۔

آیت ۲۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا﴾ ''اے نبی (ﷺ) آپ اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو''

﴿فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝۲۸﴾ ''تو آؤ میں تمہیں کچھ مال ومتاع دے کر اچھے طریقے سے رخصت کر دوں۔''

یہ آیات واقعہ ایلاء سے متعلق ہیں۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ جب فتوحات کے باعث مدینہ میں کثرت سے مالِ غنیمت آنا شروع ہوا تو مجموعی طور پر مسلمانوں کے ہاں خوشحالی آنا شروع ہوگئی۔ ان حالات میں بربنائے طبع بشری ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی طرف سے بھی تقاضا آیا کہ اب ان کے نفقات بھی بڑھائے جائیں۔ حضور ﷺ نے اس مطالبے کو سخت ناپسند فرمایا اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ آپؐ مسجد کے ساتھ ایک بالا خانے میں منتقل ہو گئے اور ایک ماہ تک آپؐ نے اپنی کسی بھی اہلیہ محترمہ کے پاس نہ جانے کی قسم کھالی۔ جونہی یہ خبر لوگوں تک پہنچی تو مدینے میں گویا ایک کہرام مچ گیا۔ ہر کوئی پریشان تھا اور ہر کسی کے ذہن میں سوال تھا کہ اب کیا ہوگا؟ کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو طلاق ہو جائے گی؟ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق ہو جائے گی؟

شوہر کی طرف سے بیوی کے ساتھ کسی وجہ سے قطع تعلقی کی قسم کھا لینے کو فقہ کی اصطلاح میں ''ایلاء'' کہا جاتا ہے۔ اس کا حکم سورۃ البقرۃ میں اس طرح آیا ہے: ﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۲۶﴾ ''جو لوگ اپنی بیویوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں' ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے' پس اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔ زیر مطالعہ آیات حضور ﷺ کے ایلاء فرمانے کے بعد نازل ہوئیں۔ ان آیات کی ہدایات کے مطابق آپؐ نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو واضح طور پر اختیار دے دیا کہ وہ دو راستوں میں سے جو راستہ چاہیں قبول کر لیں۔

آیت ۲۹ ﴿وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ

لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۲۹﴾ ''اور اگر تم اللہ اور اُس کے رسول اور آخرت کے گھر کی طالب ہو تو (اطمینان رکھو کہ) اللہ نے تم جیسی نیک خواتین کے لیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔''

اب آپ لوگوں کی مرضی ہے کہ دنیا اور اس کی آسائشیں حاصل کرنے کا راستہ اختیار کر لو یا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہتے ہوئے فقر و فاقہ کی زندگی قبول کر لو۔

اس آیت کے نزول کے وقت رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں چار بیویاں تھیں۔ حضرت سودہ' حضرت عائشہ' حضرت حفصہ اور حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہن۔ ابھی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے حضور ﷺ کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ روایات کے مطابق حضور ﷺ نے سب سے پہلے یہ بات حضرت عائشہؓ کے سامنے رکھی اور ان سے فرمایا کہ اس معاملے میں اپنے والدین کی رائے لے لو' پھر فیصلہ کرو۔ انہوں نے بلا توقف عرض کیا: ''کیا یہ معاملہ میں اپنے والدین سے پوچھوں؟ میں تو اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کی طالب ہوں۔'' اس کے بعد حضور ﷺ نے باقی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے ایک ایک کے پاس جا کر یہی بات فرمائی اور ہر ایک نے وہی جواب دیا جو حضرت عائشہؓ نے دیا تھا۔ اور یوں سب ازواجِ مطہراتؓ اپنے مطالبات سے دستبردار ہو گئیں۔ اس کے بعد حضور ﷺ کی تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے اپنی زندگیاں اس طرح گزار دیں کہ حضور ﷺ کے کسی ایک گھر میں بھی متواتر دو وقت کا چولہا کبھی گرم نہ ہوا۔

آیت ۳۰ ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۭ﴾ ''اے نبیؐ کی بیویو! تم میں سے جو کوئی (بالفرض) کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرے گی اسے دوگنا عذاب دیا جائے گا۔''

﴿وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰﴾ ''اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔''

یہ نہ سمجھنا کہ آپ نبیؐ کی بیویاں ہو اور نبیؐ آپ کو بچا لیں گے۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کا قانون بہت واضح ہے کہ اگر کسی شخص کے اپنے اعمال درست نہ ہوں تو آخرت میں اسے کوئی دوسرا نہیں بچا سکے گا۔ اس حوالے سے حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کا ذکر قرآن میں کثرت سے آیا ہے۔ سورۃ التحریم میں حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کا ذکر بھی ہے کہ وہ دونوں انبیاء کی بیویاں ہوتے ہوئے بھی عذاب سے نہ بچ سکیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝۲۱۴﴾ (الشعراء) نازل ہوئی تو رسول

اللہ ﷺ نے قریش کے تمام خاص و عام کو بلا کر جمع فرمایا اور ایک ایک قبیلے کا نام لے کر اس کے افراد کو مخاطب فرمایا: ((یا بنی کعب بن لؤی!..... یا بنی مُرة بن کعب!..... یا بنی عبد شمس!..... یا بنی عبد مناف!..... یا بنی هاشم!..... یا بنی عبدالمطلب!)) اور ہر ایک کو یہی فرمایا: ((اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ)) ''اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ!'' آخر میں آپ ﷺ نے اپنی پیاری بیٹی سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرتے ہوئے بھی یہی فرمایا: ((یَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ اَنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ ، فَاِنِّیْ لَا اَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا)) ''اے محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ! اس لیے کہ میں تم لوگوں کو اللہ کی گرفت سے بچانے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا۔'' (صحیح مسلم' ح:۲۰۴)

دوسری روایت کے مطابق آپ ﷺ نے اپنے خاندان کے افراد کو بھی نام لے لے کر مخاطب فرمایا: ((یَا عَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ! لَا اُغْنِیْ عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا ، یَا صَفِیَّةُ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ! لَا اُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا، یَا فَاطِمَةُ بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ! سَلِیْنِیْ بِمَا شِئْتِ، لَا اُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا)) (صحیح مسلم' ح:۲۰۶) ''اے (میرے چچا) عباس بن عبدالمطلب! میں اللہ کے محاسبے کے وقت آپ کے کچھ کام نہ آ سکوں گا۔ اے اللہ کے رسول کی پھوپھی صفیہ! میں اللہ کے محاسبے کے وقت آپ کے کچھ کام نہ آ سکوں گا۔ اے اللہ کے رسول کی بیٹی فاطمہ! مجھ سے جو چاہو مانگ لو لیکن میں اللہ کے محاسبے کے وقت تمہارے کچھ کام نہ آ سکوں گا۔''

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ آیت قرآنی کے الفاظ کا یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ' نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے کسی بے حیائی کا اندیشہ تھا' بلکہ اس سے مقصود آپ ﷺ کی ازواج کو یہ احساس دلانا تھا کہ اسلامی معاشرے میں ان کا مقام جس قدر بلند ہے اسی کے لحاظ سے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت سخت ہیں' اس لیے ان کا اخلاقی رویہ انتہائی پاکیزہ ہونا چاہیے۔

آیت ۳۱ ﴿وَمَنْ یَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ﴾ ''اور جو کوئی تم میں سے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت پر کاربند رہے گی اور نیک عمل کرے گی تو اسے ہم دوگنا اجر دیں گے''

﴿وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِیْمًا﴾ ''اور اُس کے لیے ہم نے عزّت والا رزق تیار کر رکھا ہے۔''

جنت میں انہیں ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا جائے گا۔

آیت ۳۲ ﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ ''اے نبیؐ کی بیویو! تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو''

مراد یہ ہے کہ نبی مکرم ﷺ کی بیویاں ہونے کی حیثیت سے تمہیں تا قیامِ قیامت امت کی خواتین کے لیے اُسوہ بننا ہے۔

آئندہ آیات میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو پردے سے متعلق خصوصی ہدایات دی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی ہدایت یہ ہے:

﴿اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ﴾ ''اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو گفتگو میں نرمی پیدا نہ کرو''

جیسا کہ قبل ازیں بیان ہو چکا ہے' ان آیات کے نزول کے وقت عربوں کے رواج کے مطابق غیر مرد ایک دوسرے کے گھروں میں بے دھڑک آتے جاتے تھے اور گھر کی عورتوں سے بلا روک ٹوک گفتگو بھی کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلی ہدایت یہ دی گئی کہ اگر کسی مرد سے تمہیں براہِ راست کبھی کوئی بات کرنی پڑے تو تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ تمہاری آواز میں کسی قسم کی نزاکت' نرمی یا چاشنی کا شائبہ تک نہ ہو۔

﴿فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ﴾ ''کہ وہ شخص جس کے دل میں روگ ہے وہ کسی لالچ میں پڑ جائے''

ظاہر ہے کہ منافق بھی اسی معاشرے میں موجود تھے اور وہ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان تراشی کا واقعہ اس کی واضح مثال ہے' جس کی تفصیل ہم سورۃ النور میں پڑھ چکے ہیں۔ چنانچہ پہلے اقدام کے طور پر یہاں غیر محرم مَردوں سے بات چیت میں احتیاط کا حکم دیا گیا ہے' کیونکہ مخاطب خاتون کی آواز میں نرمی اور لوچ محسوس کر کے گندی ذہنیت کے حامل کسی شخص کے دل میں کوئی منفی آرزو پیدا ہو سکتی ہے اور وہ بات آگے بڑھانے کی کوشش کا سوچ سکتا ہے۔

﴿وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾﴾ ''اور بات کرو معروف انداز میں۔''

اندازِ گفتگو میں نہ نرمی و نزاکت کی جھلک ہو اور نہ ہی ترشی و تلخی کا رنگ' بس معقول اور معروف انداز میں صرف ضرورت کی بات چیت ہونی چاہیے۔

آیت ۳۳ ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ ’’اور تم اپنے گھروں میں قرار پکڑو‘‘

ایک مخلوط معاشرے کو اسلامی معاشرے میں بدلنے کے سلسلے میں دوسری ہدایت یہ ہے کہ عورت کا اصل اور مستقل مقام اس کا گھر ہے۔ چنانچہ اسے چاہیے کہ وہ گھر کے اندر رہ کر ماں‘ بہن‘ بیٹی یا بیوی کا کردار خوش اسلوبی سے ادا کرنے کی کوشش کرے۔

﴿وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى﴾ ’’اور مت نکلو بن سنور کر پہلے دورِ جاہلیت کی طرح‘‘

تبرّج کے معنی ہیں نمایاں ہونا اور نمائش کرنا۔ یہاں اس سے عورتوں کا بناؤ سنگھار کر کے غیر مَردوں کے سامنے خود کو نمایاں کرنے کا عمل مراد ہے۔ اس عمل کا مقصد عورت کی اس خواہش کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں اور وہ ان کی توجہات کا مرکز بنے۔ عربوں کے ہاں تو اپنے تمدن اور طرزِ معاشرت پر بڑھ چڑھ کر فخر کیا جاتا تھا اور وہ فرعون کی طرح اسے ’’مثالی کلچر‘‘ ﴿بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾﴾ (طٰہٰ) قرار دیتے ہوں گے‘ لیکن قرآن نے ان طور طریقوں کو ’’جاہلیت‘‘ کی علامت قرار دیا ہے اور مسلمان خواتین کو ہدایت کی ہے کہ وہ خود کو اپنے گھروں تک محدود رکھیں اور بن ٹھن کر باہر نکلنے کے طور طریقے ترک کر دیں۔

﴿وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ’’اور نماز قائم کرو‘ زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت پر کاربند رہو۔‘‘

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿٣٣﴾﴾ ’’اللہ تو بس یہی چاہتا ہے اے نبیؐ کے گھر والو! کہ وہ دور کر دے تم سے ناپاکی اور تمہیں خوب اچھی طرح پاک کر دے۔‘‘

اے نبیؐ کی بیویو! جس طرح محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی مثالی شخصیت میں امت کے لیے اُسوہ ہے‘ اسی طرح تمہاری شخصیات کو بھی پوری امت مسلمہ کی خواتین کے لیے اسوہ اور نمونہ بننا ہے۔ اس لیے اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں ہر طرح کی آلائشوں سے پاک اور صاف کر کے تہذیبِ نفس‘ تصفیۂ قلب اور تزکیۂ باطن کا اعلیٰ مرتبہ عطا فرمائے۔

یہاں پر اَهْلَ الْبَيْتِ کے خطاب کی مخاطب بلاشبہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن ہیں‘ کیونکہ خطاب کا آغاز ہی يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ کے الفاظ سے کیا گیا ہے اور اس سے پہلی اور بعد کی آیات میں سارا خطاب انہی سے ہے۔ اس سے پہلے سورۂ ہود کی آیت ۷۳ میں بھی یہ لفظ (اَهْلَ

البیت) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ محترم حضرت سارہؓ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جب فرشتے انسانی شکلوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر آئے تو انہوں نے حضرت سارہؓ کو مخاطب کر کے یوں کہا: ﴿رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ﴾ ’’اللہ کی رحمتیں اور اُس کی برکتیں ہوں تم پر اے (نبیؐ کے) گھر والو!‘‘ چنانچہ اس ضمن میں کوئی ابہام نہیں ہونا چاہیے کہ ’’اہلِ بیت‘‘ سے اصلاً ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن مراد ہیں۔ البتہ حضرت فاطمہؓ‘ حضرت علیؓ اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کے بارے میں اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی حضور ﷺ کا یہ فرمان: ((اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ اَهْلُ بَيْتِيْ فَاَذْهِبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِيْرًا))(۱) گویا ان شخصیات کو بھی اہل بیت کے دائرے میں شامل کرنے سے متعلق ہے کہ اے اللہ! یہ لوگ بھی میرے اہلِ بیت ہیں‘ چنانچہ ان سے بھی گندگی دور کر دے اور انہیں پاک کر دے۔

آیت ۳۴ ﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ﴾ ’’اور یاد کیا کرو جو تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں اور حکمت کی باتیں (سنائی جاتی ہیں)۔‘‘

آپ لوگوں کے گھروں میں اللہ کے رسول ﷺ پر وحی نازل ہوتی ہے اور یہاں سے دنیا بھر کو آیاتِ الٰہی اور حکمت و دانائی کی تعلیم دی جاتی ہے‘ اس لیے آپ لوگ سب سے بڑھ کر آیاتِ الٰہی کو سننے اور ان پر عمل کرنے کی مکلّف ہو۔ اس لحاظ سے بھی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے درمیان حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو امتیازی شرف حاصل ہے۔ حضور ﷺ نے ایک بار حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا تھا: ((فَاِنَّهٗ وَاللّٰهِ مَا نَزَلَ عَلَيَّ الْوَحْيُ وَاَنَا فِيْ لِحَافِ امْرَاَةٍ مِنْكُنَّ غَيْرِهَا))(۲) ’’اللہ کی قسم‘ مجھ پر اس حال میں کبھی وحی نازل نہیں ہوئی کہ میں تم میں سے کسی عورت کے لحاف میں ہوں سوائے عائشہؓ کے۔‘‘ ظاہر ہے وحی کا نزول تو حضور ﷺ کے قلب مبارک پر ہوتا تھا۔ اس کے لیے ظاہری طور پر تو کوئی خاص اہتمام کرنے اور جبرائیل علیہ السلام کو استیذان کی ضرورت نہیں تھی۔ جب اور جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا وحی کے ساتھ آپؐ کے دل پر نازل ہو گئے۔

آیت میں ’’حکمت‘‘ سے وحی خفی یعنی حضور ﷺ کے فرمودات مراد ہیں۔ گویا حکمتِ

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب تفسیر القرآن‘ باب ومن سورة الاحزاب ۔ ح:۳۷۸۷‘ ۳۸۷۱۔

(۲) صحیح البخاری‘ کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ‘ باب فضل عائشة رضی اللہ عنہا۔

نبویؐ کی تعلیمات سے بھی سب سے بڑھ کر ازواجِ نبیؐ ہی مستفیض ہو رہی تھیں۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ کَانَ لَطِیۡفًا خَبِیۡرًا ﴿۳۴﴾﴾ ''یقیناً اللہ بہت باریک بین' ہر چیز سے باخبر ہے۔''

آیت ۳۵ ﴿اِنَّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَالۡمُسۡلِمٰتِ وَالۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ﴾ ''یقیناً مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں' اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں''

''مسلم'' کے لفظی معنی ہیں فرمانبردار اور سرِتسلیم خم کرنے والا۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اس آیت کے ساتھ سورۃ النور کی آیت ۳۵ کی ایک خاص مناسبت ہے۔ سورۃ النور کی مذکورہ آیت یہ ہے: ﴿اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ مَثَلُ نُوۡرِہٖ کَمِشۡکٰوۃٍ فِیۡہَا مِصۡبَاحٌ ؕ اَلۡمِصۡبَاحُ فِیۡ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّہَا کَوۡکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوۡقَدُ مِنۡ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیۡتُوۡنَۃٍ لَّا شَرۡقِیَّۃٍ وَّلَا غَرۡبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیۡتُہَا یُضِیۡٓءُ وَلَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡہُ نَارٌ ؕ نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ ؕ یَہۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَیَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۳۵﴾﴾ ''اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اس کے نور کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق' اس (طاق) میں ایک روشن چراغ ہے' وہ چراغ شیشے (کے فانوس) میں ہے' اور وہ شیشہ چمک رہا ہے جیسے کہ ایک چمکدار ستارہ ہو' وہ (چراغ) جلایا جاتا ہے زیتون کے ایک مبارک درخت سے' جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی' قریب ہے اس کا روغن (خود بخود) روشن ہو جائے' چاہے اسے نہ چھوئے آگ۔ روشنی پر روشنی۔ اللہ ہدایت دیتا ہے اپنی روشنی کی جس کو چاہتا ہے' اور اللہ یہ مثالیں بیان کرتا ہے لوگوں کے لیے' جبکہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

سورۃ النور کی اس طویل آیت میں ایمان کی ماہیت وحقیقت اور ایمان کے اجزائے ترکیبی کا ذکر ہے۔ لیکن دل میں حقیقی ایمان کے جاگزیں ہو جانے کے باعث متعلقہ شخصیت کے اندر جو اوصاف پیدا ہوتے ہیں ان کا ذکر آیت زیرِ مطالعہ میں آیا ہے۔ یہاں خصوصی طور پر ایک نکتہ یہ بھی سمجھ لیں کہ سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب میں معاشرتی اصلاحات کے بارے میں جو احکام آئے ہیں ان میں عورتوں سے متعلق مسائل کی خصوصی اہمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت زیرِنظر میں یہاں خصوصی طور پر مَردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا ذکر علیحدہ صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے' جبکہ اس ضمن میں قرآن کا عمومی اسلوب یہی ہے کہ اکثر احکام مذکر کے صیغے میں دیے جاتے ہیں' یعنی مَردوں کو مخاطب کر کے ایک حکم دے دیا گیا اور بر سبیلِ ''تغلیب'' عورتیں خود

بخود اس حکم میں شامل ہو گئیں۔ جیسے وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ مذکر کا صیغہ ہے لیکن اس حکم میں مرد اور عورتیں سب شامل ہیں۔ بہرحال اس آیت میں تکرار کے ساتھ مَردوں کے ساتھ خصوصی طور پر عورتوں کا ذکر کر کے دونوں کے لیے دس اوصاف گنوائے گئے ہیں:

﴿وَالۡقٰنِتِیۡنَ وَالۡقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیۡنَ وَالصّٰدِقٰتِ﴾ ''اور فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں' اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں''

''صدق'' سے مراد یہاں زبان کی سچائی کے ساتھ ساتھ عمل اور کردار کی سچائی ہے۔

﴿وَالصّٰبِرِیۡنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالۡخٰشِعِیۡنَ وَالۡخٰشِعٰتِ﴾ ''اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں' اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں''

یعنی اللہ کے حضور جھک کر رہنے والے مرد اور عورتیں۔

﴿وَالۡمُتَصَدِّقِیۡنَ وَالۡمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیۡنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ﴾ ''اور صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں' اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں''

﴿وَالۡحٰفِظِیۡنَ فُرُوۡجَہُمۡ وَالۡحٰفِظٰتِ﴾ ''اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں''

﴿وَالذّٰکِرِیۡنَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا وَّالذّٰکِرٰتِ﴾ ''اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں''

﴿اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّاَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۳۵﴾﴾ ''اللہ نے ان سب کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔''

اللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجۡعَلۡنَا مِنۡھُمۡ —— آمین!

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں'
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا:
حکایت فسادِ بنی اسرائیل

ڈاکٹر صہیب حسن ☆

پچھلے دنوں نام نہاد سپر پاور کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے بیت المقدس (یروشلم) کے بارے میں متنازعہ بیان کے بعد نہ صرف عالمِ اسلام میں بلکہ اقوامِ عالم میں جو کھلبلی مچی ہے اس کے تناظر میں یہود کی ریشہ دوانیوں اور شیطانی کارستانیوں کا تذکرہ ہر محفل میں زیر بحث ہے۔ ہم بھی اس مناسبت سے بنی اسرائیل کے ان دو فسادوں کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں' جن کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل (الاسراء) کے آغاز اور اختتام پر آیا ہے۔ گویا اس مضمون میں اس سورت کی آیات ۴ تا ۸ اور پھر آیت ۱۰۴ کا مطالعہ مقصود ہے:

﴿وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۴﴾

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (تورات) میں اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا کہ تم زمین میں دو دفعہ فساد برپا کرو گے اور بہت زیادہ تکبر کا مظاہرہ کرو گے۔''

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۵﴾

''اور پھر جب ان دونوں وعدوں میں سے پہلے کا وقت آیا تو ہم نے تم پر اپنے وہ بندے بھیجے جو بہت طاقت والے تھے' اور پھر وہ گھروں میں گھس گئے' اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہنے والا تھا۔''

☆ صدر مؤسس قرآن سوسائٹی لندن' سیکریٹری' اسلامک شریعہ کونسل' لندن (برطانیہ)
dr.suhaib.hasan@gmail.com

﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۶﴾

''پھر ہم نے تمہیں ان کے مقابلے میں ایک موقع اور دیا' مال اور اولاد سے تمہاری مدد کی' اور تمہیں تعداد میں بڑھا دیا۔''

﴿اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۡ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ﴾

''اگر تم نے اچھے کام کیے تو اپنے لیے کیے' اور اگر تم نے برے کام کیے تو وہ بھی اپنے لیے ہی کیے۔''

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۷﴾

''اور پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو (ہم نے پھر ایک قوم کو بھیجا) تاکہ وہ تمہیں روسیاہ کریں اور تاکہ وہ مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح داخل ہوں جیسے پہلے داخل ہوئے تھے اور تاکہ وہ جس چیز پر قادر ہوں اسے برباد کر کے رکھ دیں۔''

﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۸﴾

''امید ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم کرے' اور اگر تم پلٹے تو ہم بھی پلٹیں گے' اور ہم نے جہنم کو کفار کے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے۔''

﴿وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۱۰۴﴾

''اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہہ دیا کہ تم زمین میں رہو اور پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آئے گا تو ہم تم سب کو سمیٹ کر لے آئیں گے۔''

یہ آیات تاریخ کے تناظر میں کن واقعات سے متعلق ہیں؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں اختصار کے ساتھ بنی اسرائیل کی تاریخ کا جائزہ لینا ہوگا۔

بنو اسرائیل اور بنو اسماعیل کے جدِ امجد سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ مسیح علیہ السلام سے کوئی دو ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔

۱۹۰۶ قبل مسیح: یوسف علیہ السلام کی ولادت ہوئی' سترہ سال کی عمر میں بھائیوں کے مکر کی بنا پر مصر پہنچا

دیے گئے' نو دس سال جیل میں رہنے کے بعد تیس سال کی عمر میں مصر کی وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے' کوئی اسّی (۸۰) سال حکومت کرنے کے بعد ایک سو دس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اپنے عہدِ حکومت میں اپنے والد یعقوب علیہ السلام کہ جنہیں اسرائیل بھی کہا جاتا ہے' اور گیارہ بھائیوں کو مصر بلا لیا۔ کنعان سے آنے والے تمام بنی اسرائیل کی تعداد ۶۸ تھی۔ تقریباً ۴۳۰ سال مصر میں اس قبیلے کا قیام رہا۔ گو شروع میں حاکم تھے' لیکن بعد میں قبطیوں کے غلبہ کے بعد محکوم بلکہ غلام بن گئے۔

۱۵۷۱ق م: موسیٰ علیہ السلام کی ولادت' اور تیس سال کے بعد وہ بنی اسرائیل کو مصر کی غلامی سے آزاد کرا کر صحرائے سیناء میں لے آئے۔ وہاں چالیس سالہ صحرا نوردی میں ہارون علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوئی۔

۱۴۵۱ ق م: موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ یوشع بن نون جہاد کرتے ہوئے فلسطین کے شہر اریحاء (Jericho) میں داخل ہوئے' پھر فلسطین کے باقی اضلاع کو فتح کیا اور بنی اسرائیل کے بارہ قبائل بارہ علاقوں میں منقسم ہو کر رہ گئے۔ چونکہ انہوں نے کوئی مرکزی حکومت نہ قائم کی تھی اس لیے مقامی بُت پرستوں اور مشرکین کے ساتھ میل جول کے نتیجے میں اپنی انفرادیت کھو بیٹھے اور اپنی دینی روایات سے بھی دست بردار ہوتے گئے۔

۱۰۲۰ق م: ایک ہزار سال پورے ہونے کو آئے تو صموئیل نبی نے ان کے لیے طالوت کو بحیثیت بادشاہ مقرر کیا' جس کی قیادت میں جالوت کو شکست دی گئی۔ بنی اسرائیل ہی کے ایک ابھرتے نوجوان داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا تھا تو وہی بادشاہت کا مستحق ٹھہرا۔ داؤد علیہ السلام نے جبل صہیون پر ایک بستی کی بنیاد رکھی اور پھر جبل موریا پر ہیکل کی تعمیر کا بیڑا اٹھایا جسے ان کے بیٹے اور خلیفہ سلیمان علیہ السلام نے مکمل کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔

۹۷۵ق م: سلیمان علیہ السلام کی وفات' اور ان کے جاتے ہی بنی اسرائیل کی شان و شوکت ختم ہو گئی۔ سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک شمال میں 'اسرائیل' کے نام سے قائم ہو گئی جس میں دس قبائل شریک تھے' اور اس کا دارالخلافہ سامرہ (یا شکیم' موجودہ نابلس) قرار پایا۔ دوسری جنوب میں 'یہودیہ' کے نام سے جو قبیلہ یہودا اور بنی یامین کے ہاتھ میں رہی' اور اس کا دارالخلافہ بیت المقدس یا اور شلیم قرار پایا۔ یہ دونوں حکومتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتیں' ایک دوسرے

کو لوٹتیں اور غلام بناتیں۔ شمال کی سلطنت ۲۵۶ سال کے بعد عراق کے آشوریین کے ہاتھوں اپنے اختتام کو پہنچی۔ یہ شاہ سنجاریب کا زمانہ تھا۔ ۲۷ ہزار یہودیوں کو عراق میں جلاوطنی اختیار کرنی پڑی۔ جنوب کی سلطنت (یہودیہ) ۱۲۰ سال مزید قائم رہی اور اس کے بعد شاہ سنجاریب کے بیٹے بخت نصر (Nebukandnezar) کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئی۔

۵۸۷ق م: بخت نصر کا حملہ' اس نے ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور کوئی ایک لاکھ یہودیوں کو اسیر بنا کر عراق جلاوطن کر دیا گیا۔ دریائے فرات کے کنارے انہوں نے ایک بستی بسائی جسے 'تل ابیب' کا نام دیا گیا (موجودہ تل ابیب اسی کے نام پر بسایا گیا ہے)۔ یہ اسیری پچاس سال جاری رہی۔

۵۳۹ق م: فارس (موجودہ ایران) کے بادشاہ کیخسرو (Cyrus) نے بابل (عراق) فتح کر لیا اور پھر فلسطین بھی' اور یوں بنی اسرائیل کو دوبارہ فلسطین واپس آنے کا موقع ملا۔ لیکن عراق کی زرخیز زمین میں آباد ہونے کے بعد بہت کم تعداد میں لوگ واپس جانے پر آمادہ ہوئے' اور پھر عراق سے کچھ قبائل ہجرت کر کے افغانستان' ہندوستان اور دیگر ممالک میں جا بسے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کے دس قبائل اپنی شناخت کھو بیٹھنے کے بعد گمشدہ سمجھے جاتے ہیں۔

اس اسیری کے دوران عزیر' دانیال اور حزقیاہ جیسے انبیاء (علیہم السلام) ان کی رہنمائی کرتے رہے اور حضرت عزیر علیہ السلام نے تورات کو از سرِ نو ترتیب دیا۔ ان سے قبل دونوں یہودی سلطنتوں میں یسعیاہ' یرمیاہ اور حزقی ایل جیسے انبیاء (علیہم السلام) رہنمائی کے لیے موجود رہے' لیکن متذکرہ پہلے دونوں نبیوں کو بنی اسرائیل کے فاسق و فاجر عناصر کے ہاتھوں قتل ہونا پڑا۔

فلسطین واپسی کے بعد ۲۰۶ سال فارسیوں کے تحت' پھر ۱۶۶ سال یونانی حکومت کے باج گزار رہے۔ اس دوران ہیکل کی دوسری تعمیر عمل میں آئی۔

۱۶۸ق م: مکابی کاہن اور اس کے پانچ بیٹوں کی جرأت و ہمت نے انہیں اگلے ۹۳ سال کے لیے دوبارہ حکومت کا موقع دیا جو بالآخر رومن ایمپائر کے قبضے کے بعد ۶۸ ق م میں اختتام کو پہنچی۔

مسیح علیہ السلام کی ولادت کے بعد سے مسیحی کیلنڈر کا اعتبار کیا جائے گا۔

سن ۶ء: میں رومی گورنر پونٹس پلاطوس کا عہد شروع ہوتا ہے اور اسی کے دور میں بقول نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کے صلب کا واقعہ پیش آیا۔ عیسیٰ علیہ السلام سے قبل یہودی دو عظیم انبیاء زکریا علیہ السلام اور ان کے

بیٹے یحییٰ علیہ السلام کو ٹھکانے لگا چکے تھے۔

۷۰ء: یہودیوں کی نہ رکنے والی سرکشیوں کے نتیجہ میں رومن کمانڈر ٹائٹس نے بیت المقدس کو دوبارہ تاخت وتاراج کیا۔ ہیکل دوم کی عمارت کو بھی زمین بوس کر دیا' صرف ایک دیوار باقی رہ گئی جسے اب 'دیوارِ گریہ' (Wailing Wall) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تب ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودی تلوار کی گھاٹ چڑھے۔

۱۳۵ء: رومن بادشاہ ہیڈرین کے حکم سے بچے کھچے تمام یہودیوں کو جلاوطن کر دیا گیا' ایک عظیم مقدار کو روم لے جایا گیا اور ان سے وحشیانہ سلوک کیا گیا۔ یہاں سے یہودیوں کا تمام عالم میں پھیلنے کا زمانہ شروع ہوتا ہے جب کہ بیت المقدس ان کے وجود سے پاک ہو چکا تھا۔

اکثر یہودی اسے اپنے بداعمال کا شاخسانہ سمجھتے ہیں' اپنی جلاوطنی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا کا نام دیتے ہیں اور ان میں سے کچھ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ جب تک اللہ کی طرف سے بلاوا نہ آئے ہمیں بیت المقدس دوبارہ واپس جانے کا کوئی حق نہیں۔ یہیں سے ان کے ہاں مقدس گائے کا نظریہ پیدا ہوا۔ یعنی جب تک دسویں گائے پیدا نہ ہوگی' ان کے گناہوں کی تطہیر نہ ہو سکے گی۔ پہلی گائے تو وہ ہے کہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ذبح کی گئی تھی' جس کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ البقرۃ میں ملتا ہے' اور اس کے بعد آٹھ گائیں اور ذبح ہو چکی ہیں اور اب دسویں گائے کا زمانہ آ چکا ہے۔ کچھ مَن چلوں نے ۱۹۹۲ء میں اسرائیل کے ایک فارم میں اس بچھڑے کا پتہ لگا لیا تھا جس میں مطلوبہ وموعودہ گائے کی تمام صفات کا دکھائی دیا جانا ثابت کیا گیا تھا۔ اُسے میلوڈی (Melody) کا نام بھی دیا گیا تھا اور مقصود یہ تھا کہ پہلے ہیکل بنے گا' اور پھر اس کی قربان گاہ پر میلوڈی کو قربان کیا جائے گا اور اس کی قربانی سے بالآخر یہود پاک وصاف ہو جائیں گے۔ بعدازاں چند کاہنوں نے اس گائے کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد اس کی اصلیت کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا اور یوں میلوڈی کا افسانہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

۳۱۳ء: ان تین صدیوں میں عیسائیت کو عروج حاصل ہو چکا تھا۔ رومی سلطنت کی ملکہ ہیلانت نے بیت المقدس میں اس جگہ پر جہاں عیسائی مزعومات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وفات کے بعد دوبارہ زندگی پا کر آسمانوں کی طرف رجوع ہوا تھا' ایک عظیم کیتھیڈرل تعمیر کرنے کا حکم

دیا' جو کہ 'کنیسۃ القیامۃ' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ صخرہ یا وہ چٹان جسے یہود کے نزدیک مقدس سمجھا جاتا تھا' اسے کوڑے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا گیا۔

۶۱۰ء کے بعد نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ کا دور شروع ہوتا ہے کہ جس میں رسول اللہ ﷺ کا راتوں رات بیت المقدس کا سفر (اسراء)' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بیت المقدس کا فتح کیا جانا' صخرہ کی صفائی اور قبلے کی سمت بانس' لکڑی اور دوسرے سامانِ تعمیر کی مدد سے مسجد کا قیام شامل ہے۔ گویا مسجد اقصیٰ کے احاطہ میں معبد سلیمانی کے بعد پہلی دفعہ باقاعدہ مسجد کا قیام عمل میں آیا۔ ابن عاشور کے مطابق اس مسجد کی تعمیر کے چونتیس سال بعد ایک عیسائی مؤرخ نے اس مسجد کے دیکھے جانے کا اعتراف کیا ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس مسجد میں تین ہزار نمازیوں کی گنجائش تھی۔ اور پھر ہجرت رسول کے ۶۶ سال بعد اموی خلیفہ عبدالملک اور اس کے جانشین ولید کے زمانے میں گنبد صخرہ کی تعمیر کی گئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعمیر کردہ مسجد کی جگہ ایک عظیم الشان مسجد کھڑی کر دی گئی کہ جسے آج مسجد اقصیٰ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ دونوں عمارتوں کی تعمیر سات سال میں مکمل ہوئی۔

مسلمانوں کا مسجد اقصیٰ کی تولیت کا زمانہ فتح عمری سے لے کر ۱۹۶۷ء تک کا ہے کہ جس میں ۹۵ سال کا وہ دورانیہ ہے (۱۰۹۲ء سے ۱۱۸۷ء تک) جب صلیبیوں نے اس پر اپنا غاصبانہ قبضہ جمایا ہوا تھا۔ یہ کوئی ۱۲۳۴ سال کا عرصہ بنتا ہے۔ اس کے مقابلے میں بنی اسرائیل کا بلاواسطہ کنٹرول صرف ۵۱۳ سال رہا ہے جس میں حضرت داؤد علیہ السلام سے لے کر بخت نصر کے حملے تک ۴۱۳ سال اور پھر مکابی کاہن اور اس کے بیٹوں کی حکومت کے سو سال شامل ہیں۔

یہ تو بنی اسرائیل کی تاریخ کا مختصر بیان ہو گیا۔ اب ہم سورۂ بنی اسرائیل کی متذکرہ آیات کی طرف پلٹتے ہیں۔

ان آیات میں بنی اسرائیل کا دو مرتبہ فساد برپا کرنا اور اس فساد کے نتیجے میں عقابِ الٰہی کے شکار ہونے کا تذکرہ ہے۔ کیا یہ دونوں واقعات ہو چکے ہیں یا ابھی تک پردۂ غیب میں ہیں؟

اس سوال کا جواب دینے سے قبل ہم ذرا اس وعدۂ الٰہی کا جائزہ لے لیں جو سرزمین فلسطین سے متعلق تھا۔ سورۃ المائدۃ میں ارشاد فرمایا:

﴿يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى

اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ﴿۲۱﴾

''(اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:) اے قوم! ارضِ مقدس میں داخل ہو جاؤ کہ جسے اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اور پیچھے مت پلٹو کہ تم خسارے میں جا پڑو۔''

یہ فرمانا کہ ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ''اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے'' کا کیا مطلب ہے؟ اور وہاں داخل ہونا کیسے ہوگا؟

پہلے سوال کا جواب تو سورۃ الاسراء کی آیت ۱۰۴ میں موجود ہے' جہاں فرمایا:

﴿وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ﴾

''(غرقِ فرعون کے بعد) ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ زمین میں رہائش اختیار کرو۔''

آیت کا تتمہ یہ ہے کہ جب دوسرے وعدے کا وقت آئے گا تو ہم تمہیں اکٹھا کر لیں گے' جس کا مطلب یہ ہوا کہ انہیں ایک خاص عرصہ تک ارضِ مقدس میں رہنا نصیب ہوگا' پھر وہ وہاں سے نکالے جائیں گے اور پھر دوسری میعاد کے وقت انہیں دوبارہ لایا جائے گا۔

جہاں تک وہاں داخل ہونے کا تعلق ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کو وہاں داخل ہونے پر اُکسانا' ان کا اہلِ فلسطین کا ڈیل ڈول دیکھ کر جانے سے کترانا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ الفاظ کہنا کہ:

﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ﴿۲۴﴾﴾ (المائدۃ)

''پس تم جاؤ اور تمہارا رب اور تم دونوں قتال کرو' ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔''

اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انہیں جہاد کا حکم دیا گیا تھا جس سے انہوں نے انکار کیا اور اس انکار کے نتیجے میں ارضِ مقدس میں ان کا داخلہ چالیس سال کے لیے مؤخر کر دیا گیا اور یہ چالیس سال صحراءِ سینا میں صحرانوردی میں گزر گئے' اور اس دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا بھی انتقال ہو گیا اور اکثر ان لوگوں کا بھی جو مصر کی غلامی کی بنا پر جہاد کی روح سے ناآشنا ہو چکے تھے' اور پھر یوشع بن نون کی قیادت میں اس نوجوان نسل نے اریحاء کو فتح کیا جو صحراءِ سینا کی آزاد آب و ہوا میں پل کر جوان ہوئے تھے۔ اریحا میں داخلے کے بعد وہ وعدۂ الٰہی پورا ہو گیا بالکل ایسے ہی جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں اور والدین کو کہا تھا:

﴿وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ﴿۹۹﴾﴾ (یوسف)

''اور (یوسف نے) کہا: اللہ کی رضا سے مصر میں امن و اطمینان کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔''

ایک مرتبہ داخل ہونے کے بعد وہاں ہمیشہ ہمیشہ کا قیام تقدیرِ الٰہی میں نہ تھا' اس لیے ایک وقت آیا کہ بنی اسرائیل کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ ایسے ہی فلسطین کی رہائش بھی ایک میثاق سے مربوط تھی جس کا تذکرہ بھی سورۃ المائدۃ میں موجود ہے:

﴿وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴿۱۲﴾﴾

''اور جب اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد و پیمان لیا' اور ان میں بارہ سرداروں کو اٹھایا' اور اللہ نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نماز قائم کرو گے' زکوٰۃ دیتے رہو گے' میرے رسولوں پر ایمان لاتے رہو گے' ان کی مدد کرتے رہو گے اور اللہ کو قرضِ حسن دیتے رہو گے تو میں تمہاری برائیوں کو ڈھانپتا رہوں گا اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اور جو تم میں سے اس کے بعد انکار کرے گا تو وہ سیدھے راستے سے ہٹ جائے گا۔''

اور اس سے اگلی آیت بتا رہی ہے کہ ان لوگوں نے عہد و پیمان کو توڑا جس کی بنا پر اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو (وعظ و نصیحت قبول کرنے کے معاملہ میں) سخت بنا دیا۔

سورۃ الاسراء میں جن دو میعادوں کا ذکر ہے وہ اسی میثاقِ الٰہی سے روگردانی کرنے کے نتیجے میں اللہ کے عتاب کا نشانہ بننا ہے۔ اللہ کی لعنت کے مظاہر میں یہ بھی تھا کہ وہ ارضِ مقدس سے نکال دیے جائیں گے۔ اب اس تمہید کے بعد ہم سورۃ الاسراء کی آیات کی طرف لوٹتے ہیں۔

قدماء مفسرین اور علماء معاصرین کی آراء کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس سوال کا جواب ان تین آراء پر مشتمل ہے:

پہلی رائے: یہ دونوں واقعات نزولِ قرآن سے پہلے ہو چکے ہیں۔ بنی اسرائیل کا پہلا فساد حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کی سلطنت کے دو حصوں میں تقسیم ہونے کے بعد شروع ہوا تھا' اور وہ اس شکل میں کہ انہوں نے دینِ ابراہیمی میں بہت سی بدعات اور شرکیہ رسوم داخل کر دی تھیں' اور پھر انہوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی تذلیل و توہین کی' بلکہ کئی انبیاء کو قتل بھی کیا

﴿فَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۙ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ (البقرۃ) اور پھر بخت نصر کی شکل میں عقابِ الٰہی کا کوڑا نہ صرف ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجا گیا بلکہ پچاس سال تک انہیں در بدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر گیا۔ بابل کی اسیری میں انہیں توبہ تلا کرنے کی توفیق ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک اور موقع عطا کیا' کیخسرو شاہِ فارس کی مہربانی سے وہ دوبارہ فلسطین آ سکے اور ہیکلِ سلیمانی کی از سرِ نو تعمیر کر سکے۔ لیکن ایک دفعہ پھر شرک و بدعت' اللہ کی نافرمانی اور شریعت سے بغاوت انہیں فسادِ دوم کی طرف ہنکاتی رہی۔ ناصحین اور واعظین کا وہی حشر ہوا جو فسادِ اوّل کے وقت ان کا وطیرہ رہا تھا۔ زکریا اور یحییٰ علیہما السلام جیسے جلیل القدر انبیاء ان کی سازشوں کا شکار ہو کر قتل ہوئے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑایا اور بقول نصاریٰ انہیں صلیب پر لٹکا دیا۔ اور یوں ٹائٹس رومی کے روپ میں وہ دوبارہ عتابِ الٰہی کا نشانہ بنے اور اس مرتبہ بھی ہیکل کی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور ہوئے۔

دوسری رائے: دوسری رائے یہ ہے کہ ان دونوں واقعات کا تعلق نزولِ قرآن کے بعد کا ہے۔ مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل یہود کے تین قبائل بنوقریظہ' بنوقینقاع اور بنونضیر آباد ہو چکے تھے۔ وہ خود ایک رسول کی آمد کے منتظر تھے' لیکن صرف اس حسد کی بنا پر کہ محمد ﷺ کا تعلق ان میں سے نہیں بلکہ بنی اسماعیل سے تھا' آپ کی دعوت کو جھٹلایا۔ گو اللہ کے رسول ﷺ مدینہ میں آمد کے بعد ان سے معاہدے کر چکے تھے' لیکن انہوں نے یکے بعد دیگرے ان معاہدوں کو توڑا جس کے نتیجے میں انہیں جلاوطن ہونا پڑا۔ بنوقریظہ کے مَردوں کو عہد شکنی کی بنا پر انہی کے اپنے قانون کے مطابق تلوار کی گھاٹ چڑھایا گیا۔ چنانچہ میعادِ اوّل کے مصداق یہود مدینہ ٹھہرے۔

اب وہ میعادِ ثانی کے منتظر ہیں۔ یہود کا عروج تقریباً ایک سو سال (۱۹۱۷ء) سے جاری ہے' بلادِ افرنگ کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں وہ اپنی حکومت بھی بنانے میں کامیاب ہو گئے (۱۹۴۸ء) اور پھر مملکت اسرائیل کا پھیلاؤ بڑھتا گیا یہاں تک کہ انہوں نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں بیت المقدس پر بھی اپنا قبضہ جما لیا۔ گویا آیت ۱۰۴ میں میعادِ ثانی کی شق اول (یعنی ان کا دوبارہ لوٹایا جانا) ۱۹۱۷ء سے اب تک ظہور پذیر ہو رہا ہے' اور ایک وقت آئے گا کہ شق ثانی (یعنی ان کی کامل بربادی) بھی ان کے حق میں پوری ہو جائے گی۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ

حالات و واقعات بڑی تیزی سے اس ہولناک معرکے کی طرف بڑھ رہے ہیں جسے احادیث نبویؐ میں ''الملحمۃ الکبریٰ'' اور بائبل میں آرمیگاڈان (Armageddon) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

اس رائے کو بعض معاصر علماء نے پیش کیا ہے جن میں مصر کے الشیخ متولی الشعراوی اور چند دیگر علماء شامل ہیں۔ وہ اپنی رائے کے حق میں یہ دلائل رکھتے ہیں:

(۱) میعادِ اوّل کے تذکرہ میں جس قوم کو بنی اسرائیل کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا تھا ان کے لیے ''عِبَادًا لَّنَا'' (ہمارے بندے) کا وصف دیا گیا اور یہ وصف انہی لوگوں پر صادق آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا اعتراف کرتے ہوں اور یقیناً یہ وصف بخت نصر پر صادق نہیں آتا جو کہ ایک بُت پرست حکمران تھا۔

(۲) حملہ آور قوم کے لیے ﴿فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ﴾ کے الفاظ بیان کیے گئے' جس کا مطلب ہے کہ وہ ''گھروں میں گھس گئے''۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ انہوں نے خوب قتل و غارت کی' ہیکل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی' عربی لفظ ''جَاسُوْا'' اس محدودیت سے بہت زیادہ توسع چاہتا ہے' جبکہ اس کا اطلاق یہودِ مدینہ کے تینوں قبائل کے انجام سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ خاص طور پر اگر سورۃ الحشر کی آیت ۲ کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا جائے جس میں ان کے لیے ''مِنْ دِيَارِهِمْ'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

(۳) وَعْدُ الْآخِرَةِ یا میعادِ ثانی کی پہلی شق جس کا بیان آیت ۱۰۴ میں ہوا: ﴿جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا﴾ کا ظہور پہلی مرتبہ عصر حاضر میں ہو رہا ہے' یعنی یہود دنیا کے اطراف و اکناف سے ارضِ فلسطین کی طرف مسلسل کھنچے چلے آ رہے ہیں اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میعادِ ثانی کا وقت اب آ چلا ہے۔

(۴) میعادِ ثانی کے بارے میں یہ الفاظ ﴿لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ ''وہ مسجد میں ایسے داخل ہوں گے جیسے پہلی مرتبہ داخل ہوئے تھے'' بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یعنی دوسری مرتبہ حملہ آور قوم وہی ہوگی جو پہلی مرتبہ حملہ آور ہوئی تھی' اور اس کا اطلاق بخت نصر اور رومن کمانڈر ٹائٹس رومی پر نہیں ہو سکتا کہ پہلا عراق کا بت پرست تھا اور دوسرے کا تعلق رومن ایمپائر سے تھا۔

اور اگر دوسری رائے کے تناظر میں دیکھا جائے تو بیت المقدس کو پہلی دفعہ مسلمانوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں فتح کیا تھا اور احادیث کی روشنی میں بیت المقدس پر دوبارہ قبضہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزولِ ثانی کے بعد مسلمانوں کے ہاتھوں ہی ہوگا۔

تیسری رائے: تیسری رائے یہ ہے کہ میعادِ اوّل کا تعلق تو بخت نصر کے ہاتھوں بیت المقدس کی تباہی سے ہی ہے لیکن میعادِ ثانی کا تعلق موجودہ حالات سے ہے۔ اس رائے کو فلسطین کے شیخ بسام جرار اور کئی دیگر معاصر علماء پیش کر چکے ہیں۔ ان کے دلائل مختصراً یہ ہیں:

(۱) میعادِ اوّل کا تعلق یہودِ مدینہ سے نہیں جوڑا جا سکتا کہ ان آیات میں محورِ کلام بیت المقدس کے گرد گھومتا ہے۔

(۲) میعادِ اوّل کے بعد وہ چند باتیں ملاحظہ ہوں جو بنی اسرائیل کے بارے میں بیان کی گئی ہیں:

پہلی بات یہ کہ فرعون کے غرق ہونے کے بعد کہا گیا کہ اے بنی اسرائیل! اب تم اس زمین میں رہو اور یہ بھی کہا گیا کہ جب میعادِ اخیر کا وقت آئے گا تو ہم تمہیں دوبارہ اکٹھا کر دیں گے۔ خیال رہے کہ میعادِ اول کے بارے میں تو لفظ ''اُولٰهُمَا'' لایا گیا ہے لیکن بعد کے واقعات کے لیے لفظ ''ثانیھما'' یعنی میعادِ دوم'' نہیں لایا گیا بلکہ ''الْآخِرَة'' کا لفظ لایا گیا جس کا مطلب ہے کہ یہ میعاد آخر زمانہ سے متعلق ہے اور اس سے قبل کئی دوسرے حوادث پیش آ سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ میعادِ اوّل کے بعد کہا گیا کہ ہم تمہیں ایک موقع اور دیں گے' اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کریں گے۔ یہ دونوں الفاظ بھی انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ اسرائیل کے قیام سے لے کر اب تک امریکہ ہر سال اسرائیل کی لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں ڈالر کے حساب سے مدد کر رہا ہے۔ پھر بنین یعنی بیٹوں کا ذکر ہے' اولاد کا نہیں کہ جس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں۔ یہاں بیٹوں سے مراد نوجوان مردوں کی شکل میں اس طاقت کا مہیا کیا جانا ہے جو جنگ کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

تیسری بات یہ فرمائی گئی کہ ہم نے تمہیں ''نفیر'' کے اعتبار سے بڑھا دیا۔ ''نفیر'' کا لفظ ہی ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو جنگ کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔

اس سے کیا مراد ہے؟ آیا تمہارے جنگجوؤں کی تعداد پچھلے حملہ آوروں کے مقابلے میں

زیادہ ہوگی یا موجودہ مقابل آراء طاقتوں کے مقابلے میں؟ بظاہر دوسری بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ۱۹۴۸ء کی عرب اسرائیل جنگ میں تین چار عرب ممالک چوبیس ہزار سے زائد جنگجو فراہم نہ کر سکے جبکہ اسرائیلیوں کی تعداد ۶۷ ہزار کے لگ بھگ تھی۔

چوتھی بات یہ ارشاد فرمائی کہ جب وَعْدُ الْآخِرَة کا وقت آئے گا (تو پھر ایک طاقتور قوم تم پر حملہ آور ہوگی) تاکہ تمہارے چہروں کو سیاہی سے مل دے ﴿لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ﴾ یہ دراصل اس بات کی تعبیر ہے کہ تمہیں رسوا کیا جائے گا اور تم منہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے۔

ملاحظہ ہو کہ جس وقت اسرائیل کا قیام ہوا ہے تو جرمنی میں ہونے والے مظالم کی بنا پر یہودیوں سے ہمدردی پائی جاتی تھی لیکن اب ستر سال کے بعد ان کے اپنے جرائم' فلسطینیوں پر ان کی زیادتیاں دیکھ دیکھ کر اقوامِ عالم ان سے نفرت کر رہی ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ کہاں ایک طرف فلسطینی بچے ان پر پتھر پھینکتے ہیں تو وہ ٹینک لے کر ان پر چڑھ دوڑتے ہیں اور زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ یورپین یونین میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ اس وقت دنیا کا خطرناک ترین ملک کون سا ہے؟ تو اسرائیل سرفہرست رہا۔ گویا ان کی رسوائی کا آغاز ہو چکا ہے۔

پانچویں بات یہ کہ وہ اسی طرح مسجد میں داخل ہوں گے جیسے پہلی مرتبہ داخل ہوئے تھے۔ مسجد سے مراد پورا بیت المقدس ہے۔ جیسے المسجد الحرام کہا جاتا ہے لیکن اس سے شہر مکہ مراد ہوتا ہے۔ سب سے پہلے بیت المقدس میں داخل ہو کر اسے برباد کرنے والے حملہ آور کی شکل میں آئے تھے (یعنی بخت نصر اور اس کی فوج) گویا اب اگلا مرحلہ باقی رہ گیا ہے جب عرب ان پر حملہ آور ہوں گے۔

چھٹی بات یہ کہ وہ جس جس چیز پر قابو پائیں گے' اسے برباد کر دیں گے: ﴿وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝۷﴾۔ ''مَا عَلَوْا'' سے مراد ہر وہ چیز ہے جس پر انہوں نے قبضہ جما رکھا تھا' یا جو ان کے دائرۂ اختیار میں تھی۔

آخری بات یہ فرمائی گئی کہ ﴿جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۝۱۰۴﴾ کہ ہم تمہیں اکٹھا کر کے لے آئیں گے۔ ''لفیف'' کو سمجھنے کے لیے ''جَنّٰتٍ اَلْفَافًا'' کے الفاظ پیش نظر رہیں۔ ہر درخت اپنی اپنی جگہ پر کھڑا ہے لیکن اس کی شاخیں دوسرے درختوں کے ساتھ اس طرح ملی ہوئی ہیں جیسے دو ہاتھوں کی انگلیاں' جبکہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ میں ڈال دیا جائے۔

اب ملاحظہ کیجیے کہ موجودہ زمانے میں یہودی کوئی پچاس مختلف اقوام میں تقسیم ہو چکے ہیں‘ وہ کوئی ستر زبانیں بولتے ہیں‘ لیکن جب سے فلسطین کی طرف ان کی ہجرت شروع ہوئی ہے وہ ایک دفعہ پھر یک جان و یک قالب ہوتے جا رہے ہیں اور کیفیت ’’اَلْفافًا‘‘ جیسی ہے یعنی قومیت اور زبان کے اعتبار سے جدا جدا لیکن پھر بھی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان تینوں آراء کا بیان ہو گیا۔ بظاہر یہ تیسری رائے کافی جچتی نظر آتی ہے لیکن ہمارا رجحان اب بھی پہلی رائے کی طرف ہے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں ایک بات انتہائی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قبیح اعمال اور قتل انبیاء جیسے جرائم کے ارتکاب کی بنا پر ان پر قیامت تک کے لیے ذلت اور رسوائی مقدر کر دی ہے۔ انہیں اگر کبھی کوئی چھوٹ ملی ہے تو یا تو ’’بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ‘‘ کی بنا پر ملی ہے اور اس سے مراد وہ عہد و میثاق ہیں جو مسلمانوں نے ان کے ساتھ اللہ کے نام پر کیے تھے‘ جیسے نبی اکرم ﷺ کا یہود کے ساتھ میثاق‘ اور یا وہ سرپرستی جو ’’بِحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ‘‘ کے مصداق کچھ لوگوں کی طرف سے حاصل ہو گی اور اس کا مظہر برطانیہ اور امریکہ کا اسرائیل کی سرپرستی کرنا ہے۔ اور پھر یہ بھی فرما دیا گیا:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ﴾ (الاعراف:۱۶۷)

’’اور جب تیرے رب نے اعلان کر دیا کہ وہ ان پر تا قیامت ایسے لوگ مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب کا مزا چکھاتا رہے گا۔‘‘

اس آیت سے پہلی رائے کو مزید تقویت پہنچتی ہے کہ بنی اسرائیل جو دو مرتبہ فساد کر چکے ہیں اور دو مرتبہ عقابِ الٰہی کا شکار بھی ہو چکے ہیں‘ اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک تنبیہہ کی تھی کہ ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ﴾ ’’امید ہے کہ تمہارا رب تم پر رحمت کرے‘‘۔ اور یہ رحمت بعثتِ نبویؐ کی شکل میں ظاہر ہوئی‘ لیکن پھر بھی نافرمانی کی تو پھر نافرمانی کی سزا بھی دی جائے گی: ﴿وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ﴾ اور سورۃ الاعراف کی مذکورہ آیت کے مطابق نافرمانی غالب رہے گی‘ اسی لیے ان پر مسلسل عذاب کا کوڑا برستا رہے گا۔

یہاں ان اشکالات کا ازالہ ہو جائے جو شیخ شعراوی کی رائے کی بنیاد ہیں:

اول یہ کہ میعادِ اوّل کے موقع پر جو لوگ حملہ آور ہوں گے انہیں ’’عِبَادًا لَّنَا‘‘ کے وصف

سے بیان کیا گیا ہے۔ گویا وہ اہلِ ایمان ہی ہو سکتے ہیں‘ بخت نصر یا ٹائٹس رومی جیسے مشرکین مراد نہیں ہو سکتے۔

شیخ بسام جرار اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ’’عِبَادَنَا‘‘، ’’عبادك‘‘ اور ’’عِبَادًا لنا‘‘ دونوں تعبیرات میں فرق ہے‘ جب عبد یا عباد کی نسبت اللہ کی طرف ضمیر متصل کے ساتھ کی جاتی ہے تو اس سے یقیناً اہلِ ایمان ہی مراد ہوں گے‘ جیسے فرمایا:

﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ (الحجر:۴۲)

’’میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہ چلے گا۔‘‘

اور اگر ’’عِبَادًا لَّنَا‘‘، ضمیر منفصل کے ساتھ لایا گیا ہے تو اس سے مطلق عبودیت مراد ہے‘ اور ظاہر ہے کہ دنیا کا ہر انسان اللہ ہی کا غلام ہے‘ اور اللہ جسے چاہے‘ اپنے ارادے کے نفاذ کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اسی لیے یہاں پر ’’عِبَادًا لَّنَا‘‘ کے بعد مخلصین‘ متقین نہیں کہا گیا بلکہ صرف ’’اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ‘‘ کہہ کر ان کی طاقت اور قوت کی طرف اشارہ کیا گیا۔ اور یہ صفت قرآن میں صرف دو جگہ پر بیان ہوئی ہے‘ ایک ملکہ سبا کے درباریوں کے قول میں کہ جب انہوں نے ملکہ سبا کی مشاورت پر کہا تھا:

﴿قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ﴾ (النمل:۳۳)

’’انہوں نے کہا: ہم بڑی طاقت والے ہیں اور بہت شدت سے لڑنے والے (زور آور) ہیں۔‘‘

اور پھر لوہے کے وصف کے طور پر بیان کیا:

﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ﴾ (الحدید:۲۵)

’’اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت ہیبت اور قوت ہے۔‘‘

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ’’عِبَادًا لَّنَا‘‘ سے کوئی بھی زور آور قوم مراد ہو سکتی ہے‘ اس کا مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے۔

دوسرا اشکال ﴿فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ﴾ سے متعلق ہے‘ ان کا کہنا ہے کہ لفظ ’’جَاسُوْا‘‘ گھروں کے اندر گھسنے اور توڑ پھوڑ کرنے تک محدود ہے‘ اور اس کا اطلاق اس کارروائی پر تو ہو سکتا ہے جو یہودِ مدینہ کے ساتھ کی گئی تھی‘ لیکن بخت نصر کے حملے پر نہیں کہ جس نے قتل و قتال

اور ہلاکت کا ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔

جواباً ہم کہیں گے کہ لغت سے مراجعت کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ لفظ قتل وقتال پر بھی دلالت کرتا ہے۔

الفراء کہتے ہیں: قَتَلُوکُم بینَ بُیوتِکُم ''تمہارے گھروں میں تمہیں قتل کیا۔''

الزجاج کہتے ہیں: ''وہ گھروں میں طواف کرتے گئے کہ کہیں کوئی شخص قتل ہونے سے بچ تو نہیں گیا ہے۔''

الطبری لکھتے ہیں: ''وہ گھروں کا طواف کرتے گئے اور ان کو آتے جاتے قتل کرتے رہے۔''

اور یہ بات تو تاریخ کا حصہ ہے کہ بنی قریظہ کو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے بعد قتل کیا گیا تھا۔

تیسرا اشکال ﴿وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ سے متعلق ہے' کہ یہ دونوں امر مسلمانوں سے متعلق ہیں کہ اخیر زمانہ میں مسلمان مسجد اقصیٰ میں فاتحانہ طور پر داخل ہوں گے جیسے پہلی مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں داخل ہوئے تھے۔ ہمارا یہ کہنا ہے کہ ''عِبَادًا لَّنَا'' کی تشریح کے مطابق بیت المقدس کی پہلی بربادی ایک مشرک بادشاہ بخت نصر کے ہاتھ پر ہوئی اور اسی طرح ہیکل ثانی کی بربادی بھی ایک مشرک کمانڈر ٹائٹس کے ہاتھ پر ہوئی' اس لیے اس آیت کا اطلاق ظہور اسلام سے پہلے کے واقعات پر پوری طرح ہو جاتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ:

(۱) دو مرتبہ کا فساد ظہور اسلام سے قبل بنی اسرائیل کی تاریخ میں ہو چکا ہے اور ﴿جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا﴾ کا تعلق بھی اس دور سے ہے جب سائرس شاہ فارس ان کو بابلیون کی اسیری سے واپس لے آیا تھا اور ان کی واپسی کے بعد بنی اسرائیل نے اپنی بداعمالیوں سے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ میعادِ ثانی کا وقت آ گیا اور پھر ان کی دوسری بربادی کا وقت آ گیا۔

(۲) بنی اسرائیل کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے معزولی کے بعد امت مسلمہ کو قبلہ اول کا وارث بنایا گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بیت المقدس مسلمانوں کی تحویل میں آ گیا۔ خود عیسائیوں نے اپنی کتابوں میں حضرت عمرؓ کا وہ وصف پایا جو فاتح بیت المقدس کے لیے لکھا جا چکا تھا۔

(۳) نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق اس امت پر بھی وہی حالات وارد ہوں گے جو بنی اسرائیل کے ساتھ ہو چکے ہیں۔ اللہ بھلا کرے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا جنہوں نے اس بات کی

طرف توجہ دلائی۔ وہ ترمذی کی اس حدیث کا حوالہ دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ))

(ح:۲۶۴۱)

''میری اُمت پر وہ کچھ گزرے گا جو بنی اسرائیل پر گزر چکا ہے' بالکل ایسے ہی جیسے جوتے کے جوڑے میں ایک پیر دوسرے پیر سے مشابہت رکھتا ہے۔''

اور اس سے بڑھ کر مشابہت کیا ہوگی کہ بنی اسرائیل سے بیت المقدس دو مرتبہ چھینا گیا اور اُمت مسلمہ سے بھی دو دفعہ چھینا جا چکا ہے۔ پہلی مرتبہ صلیبی جنگوں میں جب کہ صلاح الدین ایوبی نے ۸۷ سال کے بعد دوبارہ اسے فتح کیا۔ دوسری مرتبہ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں جس پر پورے پچاس سال گزر چکے ہیں۔ اور اس حدیث میں گناہ کبیرہ کا بھی تذکرہ ہے کہ بنی اسرائیل کی طرح اس اُمت میں بھی ایسے ناہنجار ہوں گے جو ماں سے بدفعلی تک کے مرتکب ہوں گے۔

(۴) جہاں تک بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں اور ان کی نسل در نسل اولاد کا تعلق تھا تو اول تو ان کی اکثریت دو دفعہ کی جلاوطنی کے بعد پہلی دفعہ عراق اور دوسری دفعہ اٹلی کے توسط سے ساری دنیا میں پھیل چکی تھی۔ ان میں سے وہ لوگ جو مشرق وسطیٰ میں رہ گئے یا ایران' افغانستان اور پاکستان کے شمالی علاقوں میں ہجرت کر گئے وہ تو مسلمان ہو گئے اور جو لوگ اٹلی سے ہوتے ہوئے یورپ میں پھیل گئے ان کی اکثریت نے عیسائیت کو قبول کر لیا۔ ایک تھوڑی سی تعداد اسپین میں بس گئی تھی جو اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کے طفیل اپنا وجود برقرار رکھ سکی اور وہ بھی جو ۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد شمالی افریقہ کے اسلامی ممالک' ترکی اور یورپ ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ انہی یہودیوں کو 'سفاردیم' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جن کی تعداد بہت کم ہے۔ اسرائیل کے قیام میں جن یہودیوں نے حصہ لیا ہے انہیں 'اشکنازی' کہا جاتا ہے' یعنی یورپ کے وہ یہودی جن کا اسرائیل کے بارہ قبائل سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ وہ یہودی ہیں جن کی تاریخ آٹھویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔

بحرِ خزر (Caspian Sea) اور بحرِ اسود (Black Sea) کے درمیان وہ علاقہ جو اب

آذربائیجان، جارجیا اور آرمینیا پر مشتمل ہے، تاتاری نسل سے تعلق رکھنے والی ایک قوم کا مسکن تھا، جنہیں اس وقت کی دو عظیم سلطنتوں، دولت عباسیہ اور قسطنطنیہ کی بازنطینی حکومت سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ انہوں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ یہودیت کو قبول کر لیا جائے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں سے سلامت روی کی توقع تھی۔ یہ واقعہ ۷۴۰ء میں پیش آیا۔

خزاریہ (Khazariya) کی یہ سلطنت تین سو برس قائم رہی جسے بالآخر گیارہویں صدی کے اوائل میں یوکرین کی اُبھرتی طاقت نے نیست و نابود کر دیا۔ بلادِ خزر کے یہ یہودی آرمینیا، پولینڈ، ہنگری، یعنی مشرقی یورپ کے ممالک کی طرف ہجرت کر گئے اور پھر وہاں سے مغربی یورپ اور امریکہ تک ان کی نقل مکانی جاری رہی۔ مشہور مصنف Arthur Koestler نے انہی یہود کی تاریخ اپنی کتاب "The Thirteenth Tribe" میں رقم کی ہے۔

(The Khazar Empire & its heritage)

﴿جِئۡنَا بِكُمۡ لَفِيۡفًا﴾ کا اطلاق ان لوگوں پر کیسے ہوسکتا ہے جن کا بنی اسرائیل کے بارہ قبائل سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہود میں اب بھی ایسے فرقے موجود ہیں جو علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہمیں بیت المقدس سے بطور سزا نکالا گیا تھا اور اب ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم واپسی کی تگ ودو کریں جب تک کہ ہمارے مسیحا کا ظہور نہیں ہو جاتا۔

(۵) اس لیے بہتر یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جو کچھ اس وقت سرزمین فلسطین میں ہو رہا ہے اُسے اُن احادیث کے تناظر میں دیکھا جائے جس میں علاماتِ قیامت کا بیان ہے، اور جہاں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آخر زمانہ میں دجال کا ظہور ہوگا، اس کے ساتھ اصفہان کے ستّر ہزار یہودی ہوں گے اور پھر اللہ تعالیٰ اس کی سرکوبی کے لیے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان سے دوبارہ نازل کریں گے، ان کی معاونت کے لیے مسلمانوں کے آخری خلیفہ راشد امام مہدی موجود ہوں گے، اور پھر سرزمین فلسطین ہی میں دونوں قوموں کے درمیان معرکہ برپا ہوگا، اور مقام لُد (جہاں اب اسرائیل کا Lydda ایئرپورٹ ہے) پر عیسیٰ علیہ السلام دجال کو اپنی تلوار سے قتل کریں گے۔ اور پھر وہ بشارت بھی پوری ہو جائے گی جو سورۃ النساء کی آیت ۱۵۹ سے عبارت ہے:

﴿وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ‌ ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا ﴿۱۵۹﴾﴾

’’اور کوئی بھی شخص اہلِ کتاب میں سے نہ ہوگا مگر ان (مسیحؑ) کی موت سے قبل ان پر ایمان لے آئے گا، اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہ ہوں گے۔‘‘

گویا اب بات بنی اسرائیل کی نہیں ہو رہی بلکہ صرف اہلِ کتاب یعنی یہودیوں کی ہو رہی ہے۔ احادیث مبارکہ میں بھی یہود ہی سے قتال کے الفاظ آئے ہیں اور اس ساری سرگزشت میں امت مسلمہ کے لیے بھی یہ پیغام ہے:

﴿عَسٰى رَبُّكُمۡ اَنۡ يَّرۡحَمَكُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ عُدْتُّمۡ عُدۡنَا‌ ۘ﴾

’’شاید کہ اللہ تمہارے اوپر رحمت کرے، اور اگر تم پلٹو گے تو ہم بھی پلٹیں گے۔‘‘

اس آیت میں دونوں مفہوم شامل ہیں: اگر دوبارہ فساد کرو گے تو ہم دوبارہ سزا دیں گے اور اگر تم دوبارہ توبہ وانابت اختیار کرو گے تو ہم بھی اپنی رحمت کے دروازے تم پر کھول دیں گے۔ یعنی امت مسلمہ کے لیے ایک بہت بڑی بشارت!! اب بھی وقت ہے کہ توبہ اور انابت کے ساتھ اللہ کی طرف پلٹو تا کہ نصرتِ الٰہی کے وہ وعدے پورے ہوسکیں جو اس کے منتظر ہیں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ

❁❁❁

امت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآن کی جامع ترین سورت
سُورۃُ الحدید
(اُمُّ المُسَبِّحات) کی مختصر تشریح
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
اشاعت خاص 300 روپے، اشاعت عام 150 روپے
مکتبہ خدام القرآن لاہور
قرآن اکیڈمی، 36۔کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: (042)35869501-03
فیکس: (042)35834000 ای میل: maktaba@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org

سلسلہ وار دروسِ قرآن (۲)

لوازمِ نجات

سورۃ العصر کی روشنی میں

شجاع الدین شیخ ☆

آج ہم‘ ان شاء اللہ‘ سورۃ العصر کا مطالعہ کریں گے‘ جس کا عنوان ہے: لوازمِ نجات۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری آزمائش کے لیے یہ دنیا بنائی ہے‘ جبکہ اصل معاملہ آخرت کا ہے جہاں کی نجات کے لیے ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں اور اس حوالے سے قرآن حکیم ہم سے کیا مطالبات کرتا ہے؟ ان سلسلہ وار دروس میں ہم یہ سب جاننے کی کوشش کریں گے۔ سورۃ العصر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③﴾

’’قسم ہے تیزی سے گزرتے ہوئے زمانے کی۔ بے شک تمام انسان واقعی خسارے میں ہیں۔ سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کیے اور باہم ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔‘‘

چند تمہیدی کلمات

زیرِ مطالعہ سورت کے مطالعہ سے پہلے اس سورت کے حوالے سے چند تمہیدی نکات پر گفتگو کرتے ہیں۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ سورۃ العصر قرآن حکیم کی اوّلین سورتوں میں سے ہے اور اس سورت کی عظمت و جامعیت کے حوالے سے امام شافعیؒ کے دو بہت اہم اقوال ملتے ہیں:

☆ امیر تنظیم اسلامی حلقہ کراچی شمالی

(۱) لَوْ لَمْ یُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْاٰنِ سِوَاھَا لَکَفَتِ النَّاسَ ’’اگر قرآن مجید میں سوائے اِس (سورۃ العصر) کے کچھ اور نازل نہ بھی ہوتا تو لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے یہی کافی ہوتی۔‘‘

(۲) لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ ھٰذِہِ السُّوْرَۃَ لَوَسِعَتْھُمْ ’’اگر لوگ تنہا اسی ایک سورت پر غور کریں تو یہ ان کے لیے کافی ہو جائے۔‘‘

اس سورت کے حوالے سے ایک اہم قول ابو مزینہ دارمی ؓ کا بھی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے دو حضرات ایسے تھے کہ جب بھی باہم ملاقات کرتے تو اُس وقت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے جب تک ان میں سے ایک دوسرے کو سورۃ العصر نہ سنا لیتا۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم پوری عالمِ انسانیت کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے اور یہ اللہ ربّ العزت کا خصوصی فضل ہے کہ چند جامع آیات اور سورتیں اس نے ہمیں ایسی عطا فرمائی ہیں جن میں قرآن حکیم کا ایک اجمالی جائزہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ سورۃ العصر کا شمار بھی انہی سورتوں میں ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کے مقصدِ نزول کے اعتبار سے یہ جامع ترین سورت ہے‘ بایں طور کہ ہدایت کے تقاضے کا ایک پہلو یہ ہے کہ انسان کو معلوم ہو جائے کہ اس نے کیا کرنا ہے تاکہ وہ ابدی خسارے سے بچ سکے۔ اور یہ موضوع بڑی جامعیت کے ساتھ سورۃ العصر میں بیان ہوا ہے۔

سورۃ العصر کا مطالعہ بلحاظ تذکّر

اس تمہیدی گفتگو کے بعد اب ہم سورۃ العصر کا مطالعہ کرتے ہیں —— قرآن حکیم کو دو اعتبار سے سمجھا جا سکتا ہے: ایک ہے تذکّر یعنی سرسری طور پر غور و فکر کرنا اور دوسرا ہے تدبّر یعنی گہرائی میں اُتر کر قرآنی آیات پر غور و فکر کرنا۔ پہلے ہم اس سورت پر تذکّر کے اعتبار سے غور کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم پانچ باتیں جاننے کی کوشش کریں گے۔

پہلی بات زورِ کلام اور انتہائی تاکیدی اسلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر بات بیان فرمائی اور دوسری آیت میں عربی زبان کا انتہائی تاکیدی اسلوب اختیار کیا گیا۔

دوسری بات کامیابی اور ناکامی کا معیار ہے۔ آج ہمارا کامیابی اور ناکامی کا معیار مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک جس کے پاس دولت ہے وہ کامیاب ہے اور جس کے پاس دولت نہیں

وہ ناکام ہے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو بڑی مفلسی کی زندگی بسر کر رہے تھے تو ان کے بارے میں کیا رائے رکھی جائے گی؟ معاذ اللہ! یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ انسانی معیار کا اعتبار کیا جائے۔ مرنے کے بعد ہمیں اللہ ربّ العالمین کو جواب دینا ہے تو اس کے نزدیک کامیابی اور ناکامی کا کیا معیار ہے' وہ بیان فرمایا تیسری آیت میں کہ جن لوگوں میں یہ چار چیزیں ہوں گی وہی کامیاب قرار پائیں گے۔

تیسری بات نجات کے لیے چار شرائط (۱) ایمان' (۲) عمل صالح' (۳) حق کی تاکید' اور (۴) صبر کی تلقین کا بیان ہے۔ پہلے سارے انسانوں کے خسارے میں مبتلا ہو جانے کو بیان کیا گیا اور پھر انہیں استثناء دیا گیا جو یہ چار شرائط پوری کریں' اور فرمایا کہ یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں نجات پا سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان میں شامل فرمائے۔ آمین!

چوتھی بات کم از کم اور ناگزیر شرائط کا بیان ہے۔ یہاں اعلیٰ درجات کا بیان نہیں ہے' بلکہ جہنم سے نجات کا بیان ہے۔ آخری بات ایک معقول اور باکردار انسان کی روش ہے۔ وہ جس کے سامنے کوئی بات آتی ہے' اگر وہ اسے صحیح لگتی ہے تو اسے قبول بھی کرے' اس پر عمل بھی کرے اور دوسروں سے خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انہیں اس کی دعوت بھی دے۔ اس کے باکردار ہونے کا امتحان اس وقت ہوگا جب اس کے نتیجے میں اس پر مشکلات آئیں اور وہ اسے برداشت کرے۔

مطالعۂ سورۃ باعتبارِ تدبّر

اب اس سورۂ مبارکہ کا تدبّر کے اعتبار سے مطالعہ کرتے ہیں اور ایک ایک بات پر رک کر غور و فکر کرنے اور بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلی آیت میں فرمایا: ﴿وَالْعَصْرِ ①﴾ ''قسم ہے تیزی سے گزرتے ہوئے زمانے کی''۔ پہلا نکتہ بات میں زور پیدا کرنے کے لیے قسم کھانا ہے۔ قسم کھانے کی ضرورت انسان کو اس وقت پیش آتی ہے جب وہ بات میں زور پیدا کرنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کی ہر بات بہت اہم ہے' لیکن جب وہ کوئی بات قسم کھا کر فرمائے تو بات میں اور زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اسے انتہائی سنجیدگی سے لینا چاہیے۔

پہلے لفظ عَصْر پر غور کرتے ہیں۔ یہ لفظ زمانے کے تیزی سے گزرنے کو نمایاں کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں لفظ دَھْر بھی استعمال ہوا ہے اور زمانہ بھی عربی زبان ہی کا لفظ ہے۔

یہاں زمانے کی قسم کھا کر بتایا گیا کہ گویا ہماری مہلتِ عمر ختم ہو رہی ہے۔ انسان کی اصل پونجی یہ وقت اور مہلتِ عمر ہے جو بڑی سرعت سے ختم ہو رہی ہے۔ ہمیں زمین پر وقت گزارنے کے لیے نہیں' بلکہ اس کو بامقصد بنا کر اُخروی زندگی کے خسارے سے بچنے' وہاں نجات پانے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

زمانے کی تاریخ کو بھی سمجھئے۔ ماضی میں بڑی قومیں اُٹھیں اور جب اُن کے کردار میں بگاڑ آیا تو وہ برباد کر دی گئیں۔ آخرت میں جو معاملہ ان کے ساتھ ہوگا وہ تو ہوگا ہی' دنیا میں بھی جن قوموں نے ایمان اور عمل صالح سے فرار اختیار کیا' اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں انہیں عبرت کا نشان بنا دیا۔

اس ضمن میں ایک برف فروش کی مثال بڑی قیمتی ہے۔ اس نے برف کا ایک بلاک آگے فروخت کے لیے خریدا ہے اور وہی اس کی اصل پونجی ہے۔ اگر وہ برف کا بلاک جلد فروخت نہیں ہوتا تو نہ صرف یہ کہ اس کو نفع سے محروم ہونا پڑے گا بلکہ اُس کی اصل رقم بھی ختم ہو جائے گی۔ جس تیزی سے برف پگھلتی ہے اسی تیزی سے ہماری مہلتِ عمر' جو ہماری پونجی ہے' وہ بھی ختم ہو رہی ہے۔ چنانچہ آج دنیا میں جو اللہ کی دی ہوئی مہلتِ عمر سے فائدہ نہیں اٹھا رہا اور کل کی تیاری نہیں کر رہا تو نہ صرف یہ کہ آخرت میں اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ عمر کا سرمایہ بھی برباد ہو جائے گا اور اس کے وجود کو جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اے اللہ! ہمیں جہنم کی آگ سے محفوظ فرما دے۔ آمین!

اب ہم سورۃ العصر کی دوسری آیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ②﴾ ''بیشک سارے انسان واقعی خسارے میں ہیں''۔ لفظ خُسْر وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے' یعنی ایک دو لاکھ یا کروڑ کا نہیں بلکہ بہت بڑا خسارہ۔ ایسی کامل تباہی و بربادی جس کی تلافی ناممکن ہو۔ اس لیے کہ معمولی خسارہ ہو تو آدمی محنت کر کے اس کی تلافی کر سکتا ہے۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں مکمل تباہی و بربادی سے محفوظ رکھے۔) جن لوگوں نے دنیا کی زندگی میں دی گئی مہلت سے فائدہ نہیں اٹھایا تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے:

﴿ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ۝۱۰۷ قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ۝۱۰۸ ﴾ (المؤمنون)

''اے ہمارے رب! (ایک بار) ہمیں اس (جہنم) سے نکال دے اگر ہم پھر (نافرمانی) کریں تو ہم واقعی ظالم ہوں گے۔ اللہ فرمائے گا کہ اسی میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔''

یہ کل کا معاملہ ہوگا' اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے معاملے سے محفوظ رکھے۔

اس آیت کے تسلسل میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ حیاتِ دنیا میں شدید مشکلات کا معاملہ ہوتا ہے اور اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو ہمارے کچھ جبلی تقاضے ہیں اور دوسرا ہماری کچھ بنیادی ضروریات ہیں جن کے حوالے سے یہ بات طے شدہ ہے کہ انسان ان کی تکمیل کے لیے محنت و مشقت کرتا ہے۔ حیوانی یا جبلی تقاضوں کے بعد جذبات و احساسات کا معاملہ آتا ہے۔ پھر یہ کہ اولاد کی پرورش کر کے جوان کیا اور وہ نافرمان نکلی یا اسی قسم کے دیگر حالات میں انسان کو مختلف صدمات جھیلنا پڑتے ہیں۔ گویا انسان کو ان ساری مشقتوں میں ڈالا گیا ہے —— اس کا تذکرہ سورۃ البلد (آیت ۴) میں کیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ۝۴﴾ ''بے شک ہم نے انسان کو پیدا ہی محنت اور مشقت میں کیا ہے'' —— پھر ان مشقتوں کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ کل انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ سورۃ الانشقاق (آیت ۶) میں فرمایا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ ۝۶﴾ ''اے انسان! تو مشقت پر مشقت برداشت کرتے جا رہا ہے اپنے رب کی طرف' پھر تو اس سے ملنے والا ہے''۔ وہاں پر اس پوری زندگی کے متعلق سوالات ہونے ہیں۔ جامع ترمذی کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ، وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ ، وَمَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَ اَنْفَقَهٗ، وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ)) (۱)

''ابن آدم کے پاؤں قیامت کے روز اپنے رب کے حضور اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کا حساب نہ لے لیا جائے: اس کی عمر کے بارے میں کہ کہاں فنا کی؟ اس کی جوانی (کی قوتوں' صلاحیتوں اور اُمنگوں) کے دور کے

(۱) سنن الترمذی' ابواب صفة القيامة والرقائق والورع' باب ما جاء فی شان الحساب والقصاص۔ ح:۲۴۱۶۔ راوی: عبداللّٰہ بن مسعود ؓ۔

بارے میں کہ کیسے گزارا؟ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ (حلال ذرائع سے کمایا یا حرام طریقے سے اور اللّوں تللّوں میں خرچ کیا یا ادائے حقوق کے لیے؟) اور جو علم حاصل ہوا تھا اس پر کتنا عمل کیا؟''

دوسری آیت کے ضمن میں یہ بھی جان لیجیے کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑے خسارے میں کون لوگ ہیں۔ سورۃ الکہف (آیت ۱۰۳' ۱۰۴) میں فرمایا گیا:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ۝۱۰۳ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝۱۰۴﴾ (الکہف)

''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے کون لوگ ہیں؟ وہ جن کی ساری محنتیں دنیوی زندگی ہی میں بھٹک کر رہ گئیں اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ ہمیں آخرت کے ابدی خسارے سے محفوظ فرمائے۔ آمین!

نجات کی لازمی شرائط

اب ہم سورۃ العصر کی آیت ۳ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا:

﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳﴾

''سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کیے اور باہم ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی''۔ خسارے سے بچنے کے لیے یہ چار بنیادی شرائط ہیں جو سمجھنے میں بہت آسان اور عمل میں بہت دشوار ہیں۔ ان چار شرائط کو علیحدہ علیحدہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایمان: پہلی شرط ہے ایمان۔ ایمان کی تعریف یہ ہے کہ کائنات کے اصل اور اساسی حق کے بارے میں انبیاء کرام علیہم السلام کی بتائی ہوئی باتوں کو تسلیم کرنے اور ان کی تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔ کائنات کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ ہمیں کیوں پیدا کیا گیا؟ ہمارا مقصدِ زندگی کیا ہے؟ دنیا کیوں بنائی گئی؟ ان تمام بنیادی سوالات کے بارے میں انبیاء کرام علیہم السلام کی بتائی ہوئی خبروں پر ایمان لانا اور ان کی تصدیق کرنا فقہی اور قانونی اعتبار سے ایمان کہلاتا ہے۔ ہم نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی ہر بات برحق ہے۔

آگے پھر ایمان کے دو درجے ہیں اور ''ایمانِ مجمل'' میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ ایمان زبان سے اقرار کرنے اور دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے۔ زبان سے اقرار ایمان کا پہلا درجہ ہے اور یہ 'قانونی ایمان' ہے۔ ایک شخص ایمان لائے اور زبان سے اس کا اقرار کرے تو ہم اسے قانونی طور پر مسلمان تسلیم کریں گے خواہ اس کے دل میں کچھ بھی ہو' کیونکہ دنیا کے فیصلے ظاہر پر ہوتے ہیں۔ دوسرا دل سے تصدیق کرنے والا ایمان ہے اور یہ 'حقیقی ایمان' ہے۔ قانونی ایمان کا عمل سے کوئی تعلق نہیں' لہٰذا نہ یہ گھٹتا ہے اور نہ بڑھتا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول بھی ہے۔

حقیقی ایمان کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ آخرت میں کسی کے صاحبِ ایمان ہونے کا فیصلہ حقیقی یعنی قلبی ایمان پر ہی ہوگا۔ دنیا میں ہم کسی کے دل میں جھانک نہیں سکتے' لہٰذا ظاہر پر فیصلہ کیا جائے گا اور ہر کلمہ پڑھنے والے کو مسلمان تسلیم کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ دلوں کے حال کا جاننے والا ہے' لہٰذا آخرت میں فیصلہ حقیقی ایمان کی بنیاد پر ہوگا۔ حقیقی ایمان گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے' جس کا اظہار انسان کے عمل میں ترقی یا کمی سے ہوتا ہے۔ امام بخاریؒ کا بھی یہی قول ہے کہ ایمان گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے اور نیک اعمال کے کرنے پر ایمانی کیفیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ دل میں ایمان ہو تو اس کا اظہار عمل میں ہوگا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر کوئی شخص نافرمانی کی روش پر قائم ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں حقیقی ایمان نہیں ہے۔

اس ضمن میں آخری بات یہ کہ اُمت کی زبوں حالی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہماری اکثریت ایمانِ حقیقی سے محروم ہے۔ ہم کلمہ گو مسلمان تو ہیں لیکن اس کا اظہار ہمارے عمل سے نہیں ہو رہا ہے اور ہماری عظیم اکثریت نماز تک نہیں پڑھتی۔ سورۂ آلِ عمران (آیت ۱۳۹) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾﴾ ''اور تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مؤمن ہو''۔ آج ہماری مغلوبیت بتا رہی ہے کہ ہمارے دلوں میں حقیقی ایمان موجود نہیں ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حقیقی ایمان کہاں سے حاصل کیا جائے۔ اس کے تین بنیادی ذرائع میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ پہلا ذریعہ صحبتِ صالحین ہے۔ برف والے کی دکان پر بیٹھ جائیں تو ٹھنڈک مل ہی جائے گی۔ ایمان والوں کی صحبت میں ان شاء اللہ ایمان کی حرارت ملے گی۔ دوسرا ذریعہ سلف صالحین کی سیرت کا مطالعہ ہے۔ سب سے بڑھ کر نبی مکرم ﷺ' انبیاء کرام علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت پڑھ کر ایمانی جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ البتہ ایمان حقیقی کے

حصول کا مؤثر ترین ذریعہ قرآن حکیم ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانفال (آیت ۲) میں فرمایا: ﴿وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا﴾ ''اور جب ان پر اس کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو یہ ان کے ایمان کو بڑھا دیتی ہیں''۔

عمل صالح: اب ہم سورۃ العصر میں بیان کردہ نجات کی دوسری شرط 'عمل صالح' پر گفتگو کرتے ہیں۔ اس حوالے سے پہلی بنیادی بات یہ کہ ہر ایسا فعل جو کسی ارادے سے' کسی خاص مقصد کے تحت اور محنت و مشقت کے ساتھ کیا جائے 'عمل' کہلاتا ہے۔ پھر عمل اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ اچھے عمل کو عمل صالح کہتے ہیں — اللہ تعالیٰ ہمیں زیادہ سے زیادہ نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے — ان اعمال کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے۔ اعمال میں عبادات' معاملات' اخلاقیات' حقوق اللہ اور حقوق العباد سب داخل ہیں۔

اعمالِ صالحہ کے حوالے سے ایک قاعدۂ کلیہ نوٹ کر لیں کہ کسی عمل کے عملِ صالح ہونے کی تین شرائط ہیں۔ سب سے پہلی شرط حسن نیت ہے۔ اعمال کی قبولیت کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ بڑے سے بڑا عمل بھی اگر دکھاوے کے لیے کیا جائے تو وہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ عمل 'معروف' کے دائرے میں ہو۔ اس کے مقابلے میں آپ نے 'منکر' کا لفظ بھی سنا ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی برا کام اگر اچھی نیت سے کیا جائے تو اس پر ثواب مل جائے۔ کسی کا مال اس لیے چرایا جائے کہ اس سے غریبوں کی مدد کرنی ہے تو نیت اگرچہ اچھی ہے مگر چوری معروف نہیں بلکہ منکر ہے' اس لیے اس پر ثواب کے بجائے گناہ ہوگا۔ تیسری شرط یہ ہے کہ وہ عمل سنت نبوی ﷺ کے خلاف نہ ہو۔ نمازِ فجر میں سنت کی دو رکعتیں ہیں' لیکن کوئی چار رکعت پڑھ لے تو یہ خلافِ سنت عمل ہے' کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فجر کی نماز میں سنت کی دو رکعتیں ہی پڑھی ہیں۔

تواصی بالحق: نجات کی تیسری شرط' جو سورۃ العصر میں بیان ہوئی' وہ تواصی بالحق ہے۔ آیئے اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تواصی کا مادہ و ص ی ہے۔ عربی زبان میں الفاظ مادہ یعنی route words سے بنتے ہیں۔ جیسے علم جس کا مادہ ع ل م ہے اور اس مادے سے عالم' معلوم' علامہ' تعلیم وغیرہ بہت سارے الفاظ بنتے ہیں۔ تواصی کے مادے (و ص ی) سے وصیت بنتا ہے جس کے معنی ہیں ایسی بات جو تاکید سے کہی جائے۔

تواصی کے معنی ہیں ایسی بات جو پورے زور شور سے بیان کی جائے اور اس کے لیے باہمی اشتراک یعنی اجتماعیت کا اہتمام کیا جائے۔ یہاں تواصی بالحق کی بات کی گئی ہے۔ حق اس چیز کو کہتے ہیں جو حقیقتاً موجود ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے سامنے کچھ چیزیں رکھی ہوئی ہیں تو یہ موجود ہیں یعنی نظر آ رہی ہیں۔ حق اس شے کو بھی کہتے ہیں جو عقلاً مسلم ہو۔ ہم کبھی کسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بھائی اتنی سادہ سی بات تمہاری عقل میں نہیں آ رہی ہے۔ حق اُس بات کو بھی کہتے ہیں جو اخلاقاً واجب ہو۔ ایک پڑوسی نے دوسرے کا نقصان کیا تو ہم کہتے ہیں کہ تم نے برا کام کیا' تم نے اس کی حق تلفی کی ہے۔ مزید یہ کہ حق اُس بات کو بھی کہتے ہیں جو بامقصد ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ حق تو یہ ہے کہ تمہیں اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ یہ ان کا حق ہے کہ تم ان کی خدمت کرو جس طرح انہوں نے بچپن میں تمہاری خدمت کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کائنات کے بارے میں بار بار فرماتا ہے کہ ہم نے اسے بامقصد پیدا کیا ہے اور پھر اللہ ربّ العزت نے اپنی ذات کے بارے میں سورۃ الحج (آیت ۶) میں فرمایا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ ''یہ اس لیے ہے کہ اللہ ہی حق ہے''۔ چنانچہ نظری اعتبار سے سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مبارکہ ہے اور عملی اعتبار سے سب سے بڑا حق یہ ہے کہ زمین اللہ کی ہے لہٰذا اس پر اللہ کی حاکمیت نافذ ہونی چاہیے۔ سورۂ یوسف (آیت ۴۰) میں فرمایا گیا: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ﴾ ''حاکمیت تو بس اللہ ہی کی ہے' اور اُس کا حکم ہے کہ اُس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو''۔ سب سے زیادہ کوشش ہمیں اسی بارے میں کرنی چاہیے۔

تواصی بالصبر : نجات کی تیسری شرط تواصی بالصبر ہے۔ لفظ صبر کا مادہ ہے ص ب ر۔ لغوی اعتبار سے اس کے معنی ہیں: جھیلنا' برداشت کرنا یا خود کو روکنا۔ دین کی اصطلاح کے طور پر اس کے معنی ہیں: ناخوشگوار حالات میں استقامت کے ساتھ ڈٹے رہنا' مخالف قوتوں سے اُلجھنا اور اپنے موقف اور مشن سے پیچھے نہ ہٹنا۔ پھر صبر کی دو اقسام ہیں۔ پہلی قسم حادثات پر صبر کرنا ہے۔ بیماری آ گئی' کاروبار میں نقصان ہو گیا یا کوئی حادثہ پیش آ گیا تو اس پر بھی صبر مطلوب ہے اور قرآن کریم اس صبر کا بھی ذکر کرتا ہے۔

دوسری قسم کسی مقصد کی خاطر صبر کرنا ہے۔ مقصد اچھا اور برا دونوں ہو سکتے ہیں۔ اس کو دو اعتبارات سے سمجھتے ہیں۔ اعمالِ صالحہ کے لیے صبر اور تواصی بالحق کے لیے صبر۔ نمازِ فجر کے

لیے بیدار ہونا' روزوں کی مشقت برداشت کرنا' دین کو سیکھنے کے لیے محنت کرنا' یہ اعمالِ صالحہ کے اعتبار سے صبر کرنا ہے۔ صبر کے حوالے سے آخری نکتہ یہ ہے کہ تواصی بالصبر کا مفہوم یہ بھی ہے کہ حق کی راہ میں جِدّوجُہد کرنے والوں کو مختلف امتحانات اور آزمائشوں پر ڈٹے رہنے اور ثابت قدمی کے ساتھ جِدّوجُہد جاری رکھنے کی تلقین کی جائے تاکہ یہ مشن آگے بڑھتا چلا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دونوں پہلوؤں سے صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اب ہم اگلی بات کی طرف چلتے ہیں اور وہ یہ کہ نجات کے لیے مندرجہ بالا چاروں شرطوں کا آپس میں ایک باہمی ربط بھی ہے۔ آیئے اس کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایمان اور عمل صالح کا باہمی تعلق یہ ہے کہ قانون کی سطح پر ایمان اور عمل جدا ہو سکتے ہیں' لیکن حقیقت کی سطح پر یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ حقیقی ایمان کا لازمی نتیجہ عمل کی صورت میں سامنے آتا ہے' اس لیے کہ جس چیز پر یقینِ قلبی ہو اُس کا لازمی اظہار عمل سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَزْنِي الزَّانِيْ حِيْنَ يَزْنِيْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ، وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ، وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ))(۱)

''کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا' کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی شرابی حالتِ ایمان میں شراب پیتا ہے۔''

گویا دل سے ایمان نکل جائے تو ایک مسلمان بھی یہ برے اعمال کرتا ہوا نظر آئے گا۔

چاروں شرائط کا باہمی ربط

عمل صالح اور تواصی بالحق کا آپس میں ربط یہ ہے کہ جس طرح برف ماحول کو سرد اور آگ گرد و پیش کو گرم کرتی ہے' اسی طرح ایک باعمل انسان اپنے پاکیزہ سیرت و کردار سے لازماً معاشرے میں بھلائی اور نیکی کو فروغ دے گا۔ نیکی تب ہی نیکی ہے جب وہ پھیلتی ہوئی نظر آئے۔ ایک بندہ واقعتاً اُس وقت مؤمن ہو گا جب اُس کے ایمان اور نیکی کا نور معاشرے میں پھیلتا ہوا نظر آئے گا۔ انسان کو یہ سلسلہ جاری رکھنا چاہیے تاکہ خود کو معاشرے کے برے اثرات سے محفوظ رکھا جا سکے۔ بندہ اگر برائی کے ماحول میں ہے اور نیکی کی دعوت نہیں دے رہا

(۱) صحیح البخاری' کتاب الحدود' باب اثم الزناۃ اور دیگر متعدد مقامات۔ و صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان نقصان الایمان بالمعاصی و نفیہ عن المتلبس۔

تو وہ برائی کا حصہ بن جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ آخرت میں جواب دہی کے وقت شرمندگی سے بچا جا سکے۔ کل اللہ تعالیٰ ہم سے پوچھے گا کہ تم نے حق کو پھیلانے کی کوشش کی یا نہیں؟ تو اس وقت شرمندگی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ کام کیا جائے۔ ہم حضور اکرم ﷺ کے امتی ہیں اور ختم نبوت کی وجہ سے تواصی بالحق اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ تاسیسی طے کر دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾ (آلِ عمران: ۱۱۰) ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی رہنمائی) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔ اُمتی ہونے کے ناطے یہ ہمارا فریضہ ہے۔

تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا باہمی تعلق یہ ہے کہ تواصی بالصبر کے مرحلے کا پیش آنا نہ صرف تواصی بالحق کا لازمی نتیجہ بلکہ دعوت کے برحق ہونے کا قطعی ثبوت بھی ہے، اس لیے کہ حق کڑوا ہوتا ہے، لہٰذا اگر واقعی حق کی بات ہو تو صبر کا مرحلہ پیش آنا ناگزیر ہے۔

اب تک ہم نے سورۃ العصر کی روشنی میں لوازمِ نجات کی چار شرائط اور ان کے باہمی تعلق کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ایمانِ حقیقی کا لازمی مظہر عملِ صالح ہے، عملِ صالح کا لازمی تقاضا تواصی بالحق ہے اور تواصی بالحق کا لازمی نتیجہ صبر ہے۔ یہ باتیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں اور اس کی عکسی صورت بھی ممکن ہے۔ صبر کا مرحلہ اگر نہیں آ رہا تو اس کا مطلب ہے کہ حق بیان نہیں ہو رہا ہے۔ حق اگر بیان نہیں ہو رہا ہے تو اس کا مطلب عمل میں کوتاہی ہے۔ اگر عمل میں کوتاہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان میں کہیں نہ کہیں کمی ہے۔ یہ چاروں شرائط نجات پانے کے لیے ضروری ہیں۔

اس ضمن میں آخری دو باتیں پیش خدمت ہیں۔ عمل میں عدم توازن کی دو صورتیں ہیں۔ ایک انتہا یہ ہے کہ اپنے ہی نفس کے تزکیے میں لگے رہنا اور دوسروں کی اصلاح کی کوشش سے خودغرضانہ اور مجرمانہ غفلت برتنا۔ یہ راہبانہ تصورِ نیکی ہے۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ اپنی ذات کو فراموش کر کے دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا اور تحریکی کاموں میں سرگرم ہونا۔ دنیا کی فکر ہے کہ وہ حق پر آ جائے اور اپنی ذات کو فراموش کر دیا جائے۔ یہ دونوں باتیں انتہا پسندانہ ہیں جبکہ ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، چاروں کام نجات کے لیے لازمی اور ناگزیر ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان شرائط کو صحیح معنوں میں اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

مثالی خاتون

عاتکہ علاؤالدین

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝۳۵﴾ (الاحزاب)

''بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، راست باز مرد اور راست باز عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں ان (سب) کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے۔''

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلدُّنْيَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا اَلْمَرْاَةُ الصَّالِحَةُ)) (رواہ مسلم)

''دنیا متاع ہے اور دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔''

میرے مضمون کا موضوع ''مثالی خاتون'' ہے۔ آیات مبارکہ، احادیث مقدسہ اور موجودہ حالات کے حوالے سے ہم جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ مثالی مسلمان خاتون کون، کیسی اور کس طرح کی ہوتی ہے۔ وہ جو شریعت پر عمل کرنے والی یا وہ جو عموماً آج ''اکثریت'' کی نظر میں ''آئیڈیل'' ہوتی ہے؟ اس حوالے سے میں اپنے موضوع کو تین حصوں میں تقسیم کروں گی۔

پہلا حصہ: اس موضوع پر قلم اُٹھانے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ یعنی اُن وجوہات کا مختصراً جائزہ کہ جو اس مخصوص موضوع کا سبب بنیں۔

دوسرا حصہ: مثالی خاتون کی خصوصیات کا بیان، وہ کون سی qualities ہیں کہ جن کی موجودگی ایک عام خاتون کو مثالی مسلمہ اور مؤمنہ کے منصب تک پہنچا دیتی ہے۔

تیسرا حصہ: اُن پہلوؤں پر نظر کہ جہاں جہاں دورِ جدید کی خاتون نے اپنی اپنی ذمہ داریوں سے انحراف کیا اور نتیجتاً معاشرہ انتشار کا شکار ہو گیا۔

پیاری بہنو! اب ہم اپنے موضوع کے پہلے حصے کی طرف آتے ہیں۔

پہلا حصہ: موضوع کی وجوہات

(۱) اللہ ربّ العزت نے مرد اور عورت کی جسمانی ساخت میں واضح فرق رکھا ہے۔ نہ صرف جسمانی بلکہ نفسیاتی لحاظ سے بھی مرد اور عورت کی اُٹھان بالکل مختلف ہے، جو کہ یقیناً اس نظامِ دُنیا کو چلانے کے لیے حکمت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

(۲) مردوں کی طرح عورت بھی عظیم امانت کی حاملہ اور شریعت کی مکلّفہ ہے۔ یہ وہ عظیم امانت ہے جس کا قرآنِ مجید میں بایں الفاظ ذکر آیا ہے:

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝۷۲﴾ (الاحزاب)

''ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی مگر اُنہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے، جبکہ انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم ہے جاہل ہے۔''

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مطابق امانت سے مراد ''فرائض'' ہیں۔ قتادہؒ و دیگر کے مطابق امانت سے مراد ''دین، فرائض اور حدود'' ہیں۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مطابق: عورت کے لیے امانت یہ ہے کہ وہ اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے۔

الغرض شریعت کے مقرر کردہ دائرہ میں جو امانتیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مرد اور عورت کے ذمہ لگائی ہیں اگر وہ ان کی حفاظت کریں تو اُن کی سعی کو قبول کیا جائے گا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ

اُنْثٰی﴾ (آل عمران:۱۹۵)

''پس منظور کر لیا اُن کی درخواست کو اُن کے رب نے' اس وجہ سے کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت.....''

﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ .....﴾(النساء:۱۲۴)

''اور جو کوئی نیکیاں کرے خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ ہو ایمان والا تو پس وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے.....''

(۳) عورت جب گھر سے باہر نکلی تو بداخلاقیوں کا شکار ہوگئی۔ قرآن مجید کے حکم ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ (الاحزاب:۳۳) ''اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو'' کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عورتوں کی اکثریت نے بلاوجہ یعنی بغیر کسی شرعی عذر کے جب گھر سے باہر قدم نکالا تو اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہوگئیں۔ مرد وزن کے میل جول اور روابط بڑھنے سے نئے نئے مسائل نے جنم لیا۔ تو بجائے اس کے کہ شریعت کے دائرے میں صحیح طور پر مسائل کا حل تلاش کیا جاتا بلکہ اُلٹا جدید دور کی روشن خیال سوچ نے عورت ذات کو غیر ضروری سہولیات دے کر معاشرے کو مزید انتشار کا شکار کر دیا۔

(۴) مَردوں کے میدانِ عمل میں دخل اندازی: اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورتوں نے اپنے اصل میدانِ کار یعنی ''گھر'' سے انحراف کیا اور یوں ظاہری دنیاوی فوائد کی خاطر جب گھریلو ذمہ داریاں نظر انداز ہوئیں تو معاشرے کو صحت مند اور اعلیٰ متوازن سوچ کے بجائے نفسیاتی عوارض کا شکار افراد میسر آئے۔ (کیونکہ نہ مردوں کے حقوق صحیح طرح سے ادا کیے گئے اور نہ ہی بچوں کو مناسب توجہ دی گئی۔)

(۵) غیر ضروری اور بلا شرعی عذر جب عورتوں کی اکثریت گھروں سے باہر نکلتی ہے تو عموماً دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ دورِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرتے کرتے ''مسلمان عورت'' نے حلیہ وہ اختیار کر لیا جو کہ کافر اقوام کی عورتوں سے مشابہ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ آج مسلمان عورت کی سوچ اور اس کے افکار بھی بہت حد تک سیکولرازم سے متاثر ہو چکے ہیں۔

دوسرا حصہ: مثالی مسلمہ اور مؤمنہ کی خوبیاں

آئیں قرآن وحدیث اور سیرتِ صحابیات رضی اللہ عنہن اور سیرتِ اَسلاف کے آئینے میں دیکھیں کہ صحیح معنوں میں ''مؤمنہ'' کون ہوتی ہے؟ شریعت کی عطا کردہ ڈھیروں خصوصیات میں سے چند

نمایاں خوبیوں کا ذکر کرنا چاہوں گی۔

i) مؤمنہ اور تعلق باللہ: سب سے پہلی اور اہم چیز اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے۔ اُس ذاتِ باری تعالیٰ پر یقین کامل کہ وہ تمام اختیارات کا مالک ہے۔ ہر شے اس کے قبضۂ قدرت میں ہے' وہی ''عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ'' ذات ہے۔

ایک مسلمہ کو دل سے یقین ہوتا ہے کہ حالات بظاہر خواہ کیسے ہی ہوں' اس کے رب کے ہاتھ میں خیر ہی خیر ہوتی ہے۔ مسلمان عورت کا ایمان ہوتا ہے اس بات پر کہ بہترین فیصلے فرمانے والی ذات ''احکم الحاکمین'' ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے سامنے بہترین مثال سیدہ ہاجرہ سلامٌ علیہا کی ہے' کہ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام انہیں اور شیر خوار ننھے اسماعیل علیہ السلام کو وادیٔ مکہ میں چھوڑ کر واپس جانے لگتے ہیں اور پوچھنے پر جب جواب ملتا ہے کہ یہ رب کا حکم ہے تو سیدہ کا ایمان مزید بڑھ جاتا ہے۔ (یقیناً سب بہنوں کو یہ واقعہ خوب یاد آ گیا ہوگا) عام حالات میں یہ واقعہ کتنا عجیب اور سخت لگتا ہے کہ ایک مرد اپنی نوجوان بیوی اور معصوم بچے کو بے آب وگیاہ جگہ پر چھوڑ کر خود دور دراز ملک شام کی طرف لوٹ رہا ہے' اپنے بیوی بچے کے لیے سوائے ایک مشکیزہ پانی اور ایک چھوٹی پوٹلی کھجوروں کے کچھ نہیں چھوڑ کر جا رہا۔ اور گہرا ایمان آپ ملاحظہ فرمائیں سیدہ ہاجرہ کا کہ جب یہ پتہ چلا کہ ابراہیم علیہ السلام نے سب کچھ حکمِ الٰہی کے مطابق کیا ہے تو ان کا دل مزید یقین سے بھر گیا اور احساسات وشعور پہلے سے زیادہ مطمئن ہو گئے۔

ii) مؤمنہ اور علمی کارنامے: اگر ہم سیرتِ صحابیات رضی اللہ عنہن کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے مشغلے عین ''اسلام'' تھے' وہ علم وہنر کے بے پناہ جوہر رکھتی تھیں۔ مثلاً ہمارے سامنے امام زہریؒ کا قول ہے کہ: ''اگر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم ایک طرف رکھا جائے اور دیگر اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن اور تمام عورتوں کا علم دوسری طرف تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم افضل ہوگا''۔ مسلمانوں کے عظیم فقیہہ عروہ بن الزبیر کا قول ہے: ''میں نے فقہ' طب اور شعر وشاعری میں سیدہ عائشہؓ سے زیادہ جاننے والا نہیں دیکھا۔''

اسی طرح کتب احادیث میں علماء بیان کرتے ہیں کہ حدیث بیان کی مجھ سے شیخہ مستندہ صالحہ فلانۃ بنت فلاں نے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے جن خواتین راویوں کا ذکر کیا ان میں وزیرہ بنت محمد بن عمر اور کریمہ بنت احمد بھی ہیں' جن کا ذکر ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب 'فتح الباری'

کے مقدمہ میں کیا ہے۔ ان عظیم خواتین کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا‘ کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کی حدیث روایت کرنے میں نہایت سچی اور امانت دار تھیں اور وہ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھیں۔ حافظ الذہبیؒ نے اپنی کتاب ’میزان الاعتدال‘ میں اس کی شہادت دی ہے‘ جنہوں نے رجال الحدیث پر نقد کرتے ہوئے چار ہزار راویوں کو متہم قرار دیا ہے‘ وہ بھی اپنا یہ قول ان پر نقد کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں کہ:

’’میں عورتوں میں سے کسی کو نہیں جانتا جس پر اتہام لگا ہو (کہ حدیث بیان کرنے میں قابل اعتبار نہیں ہے) اور جس کی حدیث قبول نہ کی گئی ہو۔‘‘ (میزان الاعتدال: ج ۳)

مندرجہ بالا محض چند مثالیں ہیں‘ ورنہ سیرت و تاریخ کا مطالعہ کریں تو گھر سے لے کر میدانِ جنگ تک‘ فقہ‘ طِب‘ شاعری‘ تجارت و کاروباری صنعتیں‘ غرض مسلمات و مومنات نے بے شمار کارنامے شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے سرانجام دیے ہیں۔

iii) عمل صالح: سورۃ النحل میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٧﴾﴾

’’جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت‘ لیکن ایمان والا ہو تو ہم اسے یقیناً نہایت بہتر زندگی عطا فرمائیں گے اور ان کے اعمال کا بہترین بدلہ بھی انہیں ضرور دیں گے۔‘‘

مندرجہ بالا آیت مبارکہ کے مطابق نہ صرف مؤمن مرد بلکہ مؤمنہ کے لیے بھی دُہرے اجر کی بشارت ہے کہ دنیا میں ’’حیاۃ طیبہ‘‘ اور آخرت میں بہترین ’’اجر‘‘ یعنی جنت —— لہٰذا مؤمنہ کو پورا پورا ادراک ہوتا ہے کہ راہِ حق پر چلتے ہوئے وہ جو تکلیف برداشت کرے گی تو مرد کی طرح وہ بھی اجر میں برابر ہوگی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿...... وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٤٠﴾﴾ (المؤمن)

’’......اور جو کوئی نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت اور وہ ہو ایمان والا تو پس وہ جنت میں داخل ہوں گے اور اس میں وہ بے حساب رزق دیے جائیں گے۔‘‘

لہٰذا مؤمنہ ہر وقت چوکنی رہتی ہے کہ اس کے اعمال اللہ تعالیٰ کی خاطر ہی ہوں اور وہ اپنے اعمال کو شریعت کے ترازو میں تولتی رہتی ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ’’غیر متوازن‘‘ اور ’’غیر

ضروری‘‘ سرگرمیوں میں مبتلا ہو گئی ہو جب کہ شریعت کا مطالبہ کچھ اور تھا۔

iv) حیا اور گناہوں سے اجتناب: شرم و حیا عورت کی فطرت میں شامل ہے‘ اور یہ وہ اخلاقی خوبی ہے کہ جس کی بدولت وہ غیر شریفانہ افعال اور گناہوں سے بچی رہتی ہے۔ ایک صالحہ کو مکمل شعور و احساس ہوتا ہے فرمانِ رسول ﷺ کا کہ: ((اَلْحَيَاءُ لَا يَاْتِيْ اِلَّا بِخَيْرٍ)) (صحیح البخاری) ’’حیا سے خیر ہی سامنے آتا ہے۔‘‘ ایک مؤمنہ نہ صرف یہ کہ لوگوں سے برتاؤ کرنے میں بلکہ اللہ تعالیٰ سے بھی بہت حیا کرتی ہے کہ کوئی ایسا عمل کر بیٹھے کہ جس سے اس کے ایمان و یقین کو کوئی نقصان پہنچے۔ وہ نبی کریم ﷺ کے فرمان مبارک کو سامنے رکھتی ہے کہ: ((اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِيْمَانِ)) (مسلم‘ کتاب الایمان) ’’حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔‘‘

لہٰذا وہ جذبۂ حیا کے تحت اپنی ایسی شناخت قائم کرتی ہے جو اُسے مغرب زدہ عورتوں سے ممتاز کرتی ہے۔ مؤمنہ بامروت اور باحیا خاتون ہوتی ہے کہ جس کے سامنے جب ستر و حجاب کے احکام آتے ہیں تو وہ عمل کرنے میں دیر نہیں کرتی۔ گویا وہ باپردہ خاتون ہوتی ہے۔ سیدہ عائشہ ؓ فرماتی ہیں: ’’اللہ تعالیٰ مہاجر عورتوں پر رحم فرمائے‘ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۠﴾ (النور: ۳۱) ’’اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں‘‘ نازل فرمائی تو انہوں نے اپنی چادریں پھاڑ کر اپنے سر اور اپنے چہرے کو ان سے ڈھک لیا۔‘‘ سیدہ عائشہ ؓ سے ایک اور روایت ہے کہ: انہوں نے اپنی چادریں لیں‘ ان کو کنارے سے ٹکڑے کیا اور ان سے اپنے سروں اور چہروں کو ڈھک لیا۔‘‘

v) گھریلو ذمہ داریوں کا احساس کرنے والی: ایک مخلص مسلمہ کو شعور ہوتا ہے قرآنی حکم کے مطابق: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم: ۶) ’’اے اہلِ ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے‘‘۔ لہٰذا وہ اپنی فکرِ آخرت کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد اور اپنے گھر والوں کے بخیر اخروی انجام اور نجات کی کوشش بھی کرتی رہتی ہے۔

صحیحین میں عبداللہ بن عمر ؓ سے مروی حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ ...... وَالْمَرْاَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ بَعْلِهَا وَوَلَدِهٖ وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ......))

’’خبردار! تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں

سوال کیا جائے گا...... اور عورت اپنے شوہر کے گھر پر نگران ہے اور اس کی اولاد پر' اور وہ اس بارے میں سوال کی جائے گی۔''

ایک اور جگہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((اَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ دَخَلَتِ الْجَنَّةَ)) (الترمذی)

''کوئی عورت مر جائے اس حال میں کہ اس کا شوہر اس سے راضی ہے وہ جنت میں داخل ہوگی۔''

اسی لیے ایک مؤمنہ اپنے ربّ کی رضا کی خاطر اپنے شوہر سے محبت کرنے والی اور اپنے بچوں کا خیال رکھنے والی ہوتی ہے۔ اور یہ وہ دو بہترین خوبیاں ہیں کہ جن کی تعریف حدیثِ مبارکہ میں بھی ہوئی ہے کہ: ''ناقہ نشین خواتین میں سب سے بہتر قریش کی عورتیں ہیں۔ وہ اپنے بچوں پر جب وہ چھوٹے ہوں بے حد مہربان ہوتی ہیں اور اپنے شوہر کے مال کی بہترین محافظ ہوتی ہیں۔'' (مسلم' کتاب الصحابۃ)

ایک مؤمنہ صالحہ بہترین بیوی' ماں' بہن اور بیٹی ہوتی ہے۔ اس کے لیے ''رول ماڈل'' امہات المؤمنین و بناتِ طاہرات اور صحابیات رضی اللہ عنہن کی مقدس ہستیاں ہوتی ہیں۔ اور خاص طور پر سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کہ جن کی گھریلو خدمات کے توسط سے ہی ہمیں قیامت تک تسبیحاتِ فاطمہ کا تحفہ عظیم ملا۔

vi) اُمتِ مسلمہ کی طرف سے مسؤلیت کا احساس: سورۃ التوبہ میں ارشاد ہوا:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ......﴾ (التوبۃ:۷۱)

''اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہیں......''

مندرجہ بالا ارشاد کے پیش نظر ایک مؤمنہ کو اپنے گھر والوں کے ساتھ ساتھ پوری اُمت کی طرف سے بھی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے اور وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ اپنے مخصوص دائرہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دیتی ہے جو کہ ربّ العزت نے اُس کی فطرت و نفسیات کے مطابق بنایا ہے۔ وہ اپنی عقل و حکمت اور حسنِ تدبیر سے معاشرے میں نیکیاں پھیلانے اور برائیوں کو مٹانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔

vii) اپنے دشمنوں کو پہچاننے والی: وہ اپنے دشمنوں سے چوکنی رہتی ہے۔ قرآن حکیم کے ارشادات کے مطابق یہود و نصاریٰ' مشرکین و کافرین اور منافقین بھی مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ لہٰذا ایک مؤمنہ ان کے معاملے میں اپنا رویہ بھی ویسا ہی رکھتی ہے جیسا کہ کسی دشمن کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مخلص مسلمہ یعنی مؤمنہ اپنے دشمنوں کی تہذیب و ثقافت سے متاثر نہیں ہوتی بلکہ اسلامی تہذیب اپناتی ہے۔

تیسرا حصہ: دورِ جدید کی خاتون کا اپنی ذمہ داریوں سے انحراف

اب میں اپنے مضمون کے آخری حصے کی طرف آتی ہوں کہ ''موجودہ دور میں مسلمہ نے کہاں کہاں اور کیسے اپنی ذمہ داریوں سے انحراف کیا۔'' تاکہ ہم سب مسلمان بہنیں اپنا اپنا جائزہ لیں اور اگر خدانخواستہ کہیں کوتاہی ہو رہی ہے تو درست رویہ اپنائیں جو کہ شرعی مزاج کا حامل ہو۔ اس سلسلے میں' میں مضمون کے دوسرے حصہ میں بیان کردہ تمام نکات کو ایک دوسرے رُخ سے پیش کرنا چاہوں گی۔

i) مؤمنہ اور تعلق باللہ: دورِ جدید کی 'ماڈرن' مسلمہ کا ایمان و توکل کیا سیدہ ہاجرہ سلامٌ علیہا جیسا ہے؟ یا سیدہ اُمّ الدحداح رضی اللہ عنہا جیسا کہ جب اُن کے شوہر یعنی ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ وہ باغ کہ جس میں ان کے بچے اور وہ خود رہائش پذیر ہیں' انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے دیا ہے اس امید پر کہ جنت میں اس کے بدلے میں کھجوروں کے خوشے ملیں گے تو اُمّ الدحداح رضی اللہ عنہا نے کہا کہ کیا خوب نفع بخش سودا ہے' کیا ہی مفید تجارت ہے! جبکہ آج ہمارا حال یہ ہے کہ گھر میں ذرا سا بھی راشن ختم ہو جائے تو عورتیں پریشان ہوتی ہیں اور دل تنگ ہو جاتا ہے۔ ناشکری کرتی ہیں اور طعنے دیتی ہیں۔ حدیث مبارکہ کے مفہوم کے مطابق عورتوں کی کثیر تعداد جہنم میں اس وجہ سے ہوگی کہ وہ شوہروں کی ناشکری کرتی ہیں' ساری عمر بھلائی کرنے والے شوہر کی طرف سے ذرا تنگی آ جائے تو کہتی ہیں کہ اس گھر میں تو میں نے کبھی کوئی خیر دیکھی ہی نہیں۔

ii) علمی کارنامے: دورِ جدید میں عورت کی تعلیم کو غیر ضروری اہمیت دی گئی اور معاملہ یہاں تک آن پہنچا ہے کہ ''فرائضِ دین'' اور ''احیائے دین بذریعہ علم و عمل'' کا تصور تو بہت پیچھے پس منظر میں کہیں رہ گیا اور آج کی مسلمات کا مطمح نظر بھی وہی تعلیم ہے جو کہ ''مغرب زدہ'' ہے۔ آج روشن خیال دور میں ایک چھوٹی سی عمر کی لڑکی جو کہ یقیناً کل کی ماں ہے' اس کو اپنے

career کی فکر ہوتی ہے‘ اور اس کے career کو بنانے میں صرف وہی نہیں بلکہ پورے گھر والوں کا تن من دھن کھپایا جاتا ہے۔ اور اگر آپ بچیوں‘ لڑکیوں اور خواتین سے محض نماز کا ترجمہ پوچھ لیں تو اکثریت ’’لاعلم‘‘ ہوگی۔ جبکہ یہ تو ہمارے دین کی ابتدائی تعلیمات ہیں کہ جن سے بہرہ ور ہونا تمام مسلمین و مسلمات کے لیے ضروری ہے۔

اسی طرح یہ چلن بھی عام ہے کہ دنیاوی تعلیم کی خاطر تو نوجوان بچیوں کو والدین بلا جھجک دور دراز کا سفر کرواتے ہیں‘ عموماً لڑکیاں تنہا کالج و یونیورسٹی آتی جاتی ہیں‘ جبکہ اگر کوئی دینی ادارہ Free Courses بھی کروائے اور وہ طالبات کی رہائش سے زیادہ دور بھی نہ ہوں‘ تب بھی طالبات اور خواتین کی اکثریت اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتی کہ "pick & drop" کے مسائل ہیں۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ دینی تعلیم کی خاطر بچیاں/لڑکیاں شرعی حدود توڑیں‘ لیکن خدارا کچھ تو وزن اور اہمیت قرآن و حدیث کی تعلیم کو بھی دیں اور ذرا جائزہ تو لیں کہ ہماری زندگی میں ان ’’علوم‘‘ کی کیا اہمیت ہے؟

iii) عمل صالح: پیاری بہنو! بڑی معذرت کے ساتھ‘ آج اگر ہم اپنے life style کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ ہم ازواجِ مطہرات‘ بنات طاہرات اور صحابیات رضی اللہ عنہن سے بالکل مختلف انداز میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ان مقدس ہستیوں کے مشاغل کثرتِ تلاوت‘ کثرتِ نوافل‘ روزہ‘ مسواک اور دیگر نیکیوں کے کام تھے‘ تو آج ہمارے فارغ اوقات کا مصرف سوشل میڈیا‘ بیوٹی پارلر‘ شاپنگ یا پھر درزیوں کی دکانیں وغیرہ ہیں۔ جبکہ مسلمہ/مؤمنہ کے لیے تو قرآن مجید میں نصیحت کی گئی ہے کہ ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ (الاحزاب:۳۳) اور ان کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ﴿الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ (النور:۲۳) گویا گھروں میں رہنے والیاں اور بھولی بھالی ہوتی ہیں‘ اور اس کے برعکس آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہی عورت کامیاب تصور کی جاتی ہے کہ جو خوب بے پردہ‘ بے عمل اور social ہوتی ہے اور جس کی دین سے کوئی دلی وابستگی نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو محض رسمی سی یعنی نماز روزے کی حد تک۔

iv) حیا اور گناہوں سے اجتناب: ﴿حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ﴾ (غیب میں حفاظت کرنے والیاں) ﴿الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ (بھولی بھالی مؤمنات) اور پھر ﴿وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولٰى﴾ (اور جاہلیت کی سی نمائش نہ دکھاتی پھرو) کی بجائے دورِ جدید کی

مسلمات ’’کَاسِیَاتٍ عَارِیَاتٍ‘‘ (جو لباس پہن کر بھی بے لباس ہوں) کا عملی نمونہ بن کر بلاتفریق گھر اور بازار میں نظر آتی ہیں۔ بُرا منائے بغیر ذرا اپنی بچیوں کے لباس کا جائزہ لیں‘ بچیوں کے لباس نامکمل (Barbie Style) اور بچوں کے مکمل —— یہ کیسا انصاف ہے اسلامی اقدار کے ساتھ کہ مسلم خواتین بھی وہی لباس و ثقافت اپنا لیں جو کہ مغرب زدہ میڈیا کے زیر اثر بازاروں میں میسّر ہے اور اسلامی تہذیب کو نظر انداز کر دیں؟

بہت سی دیگر معاشرتی خرابیوں میں ایک اور رجحان جو کہ بہت تیزی سے رواج پا رہا ہے وہ ’’Music education‘‘ کا ہے۔ پہلے پہل تو گھر گھر ناچ گانا عام ہوا‘ بذریعہ ٹی وی وغیرہ (بحوالہ مفہومِ حدیث: قربِ قیامت کی اہم علامت ناچ گانے کا عام ہونا) پھر اس پر مستزاد کہ موجودہ دور میں والدین کو کوئی عار نہیں اس بات میں کہ ان کی بیٹی/ بیٹا باقاعدہ سکول میں موسیقی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ (استغفراللہ!)

اسی طرح جب عمومی طور پر معاشرے کا چلن اسلام سے دُور ہوا تو ظاہری سی بات ہے کہ گناہوں سے بچنا ممکن نہیں رہا۔ لہٰذا آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں نیکیاں کرنا مشکل اور برائیوں کا راستہ آسان بلکہ رنگ برنگے packages کی بدولت ’’باسہولت‘‘ ہو گیا ہے۔ اور ہمارے ازلی دشمن شیطان رجیم نے خاص طور پر خواتین کو بااختیار کرنے اور ترقی دلوانے کے ایسے ایسے طریقے سجھائے ہیں کہ آج معاشرتی برائیوں کے پھیلانے میں زیادہ حصہ خواتین کا ہے۔ نئی نئی رسومات ہوں کہ خرافات‘ بدعات ہوں یا رواج‘ ذرا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ مردوں کا کام خواتین کے اخراجات پورے کرنا ہے اور خواتین مرد حضرات کی کمائی کو خود ساختہ رواجات کے بھینٹ چڑھاتی ہیں۔ ستر و حجاب کے سلسلہ میں بڑی بڑی غفلتیں تو خیر نمایاں ہیں ہی لیکن اور بھی بہت قسم کی کوتاہیاں دورِ جدید کی خواتین میں ’’عام‘‘ محسوس کی جاتی ہیں۔ مثلاً چغلی‘ غیبت‘ بہتان‘ جھوٹ‘ نمود و نمائش‘ فیشن پرستی اور مقابلہ بازی‘ قطع رحمی‘ غصہ‘ تکبر‘ حسد‘ دوسروں کا مذاق اُڑانا وغیرہ وغیرہ۔

v) گھریلو ذمہ داریوں کا احساس کرنے والی: اللہ تعالیٰ ہم سب عورتوں کی غفلتوں کو معاف فرمائے‘ گھر جو کہ عورت کا اصل میدانِ کار اور اولاد کے لیے بنیادی مرکزِ تربیت ہے‘ آج عورت کو ’’غیر ضروری‘‘ ذمہ داری‘ بوجھ یا قید محسوس ہوتا ہے۔ وجہ یقیناً یہی ہے کہ اس کی

بھی تربیت اس نہج پر نہیں ہوئی جو کہ ہونی چاہیے تھی۔ لہٰذا آج یہ سوچ عام ہے کہ گھر کا کیا ہے؟ ملازم کام کرلیں گے۔ اولاد کا کیا ہے؟ کوئی ملازمہ رکھ لو تو بچے بھی پل جائیں گے۔ بھئی تم جدید دور کی educated اور qualified high لڑکی ہو، کوئی شاندار سی جاب کرو، تمہارا مستقبل بہت اہم ہے، بڑا bright future تمہارا منتظر ہے —— وغیرہ وغیرہ۔

تعلیم کا مقصد چونکہ ''احیائے دین'' تھا ہی نہیں بلکہ ''تعلیم برائے دنیاوی مفاد'' کا تصور تھا اور اب تعلیم کو ہانڈی چولھا اور بچوں کی دیکھ بھال میں ضائع تو نہیں کیا جا سکتا نا —— لہٰذا اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ بچے اوّل تو ہونے ہی نہیں چاہئیں، اور اگر ہوں بھی تو بس دو عدد۔ اور وہ ذرا تنگ کریں تو انہیں کارٹون لگا دو یا موبائل پر گیم لگا دو۔ یہاں تک کہ دین دار گھرانوں میں بھی بچوں کے بہلانے کے ایسے یا کچھ اس سے ملتے جلتے طریقے دیکھنے میں آتے ہیں۔

صبح سے شام تک کی روٹین کا جائزہ لیں۔ صبح سویرے بچے کو ناشتا بھی اکثر مائیں healthy نہیں بنا کر دیتیں، بوجہ سستی و کاہلی، اور بس ڈبل روٹی ٹوسٹ سے کام چلایا جاتا ہے۔ پھر lunch box بھی easy made قسم کے کھانوں پر مشتمل ہوتا ہے، جو کہ اکثر صحت کے لیے کوئی اتنا اچھا نہیں ہوتا۔ لہٰذا خواتین محض چپس کے پیکٹ سے بھی کام چلا لیتی ہیں۔

اسی طرح آپ مزید جائزہ لیں، بچے صبح سکول، دوپہر اکیڈمی، شام کو ٹی وی کے آگے اور اب تو انٹرنیٹ پر بے شمار دلچسپیاں موجود ہیں۔ اب اتنے تھکے ہارے بچوں کو ماں کیا نماز سکھائے گی اور کیا قرآن پڑھائے گی؟ ہاں البتہ جن گھرانوں میں قرآنی تعلیم کا احساس ہے تو وہ بھی آدھا گھنٹہ قرآن کے لیے قاری رکھتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ بس اب ذمہ داری ختم ہو گئی۔ اس کے علاوہ کیا کبھی والدین نے سوچا کہ ان بچوں کو مستقبل میں اسلام کے مجاہدین بننا چاہیے تھا، ان کی تربیت کا ہم نے کیا انتظام کیا ہے؟ یا ایسی خواہش ہے بھی تو کہیں دل میں پوشیدہ —— یہ بچے اسلام کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ ان کو انجینئر، ڈاکٹر، سائنسدان خواہ کچھ بھی بنائیں، مگر سب سے پہلے ایک بہترین مؤمن بنائیں۔ تو کیا اس کے لیے ہمارے گھروں کا ماحول سازگار ہے؟ ماں کی گود بچے کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے تو کیا دورِ جدید کی فیشن ایبل ماں اتنی اہم ذمہ داری ادا کرنے کے قابل ہے؟ ان سوالات کے جوابات آج جب ہم ڈھونڈنا چاہیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ہم بالکل اسلام مخالف سمت میں سفر کر رہے ہیں۔

vi) **امت کی طرف سے مسؤلیت کا احساس کرنے والی:** ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آج سب

مؤمنین اور مؤمنات ایک دوسرے کے ساتھ معاونت کر کے معاشرے میں نیکیاں پھیلاتے، جبکہ اس کے برعکس آج عملی طور پر یہ صورتحال ہے:

﴿اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ .....﴾ (التوبہ:٦٧)

''منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ برائی کا حکم دیتے اور نیکی سے روکتے ہیں.....''

یہ منافقت پر مبنی دوستیاں اور روابط ہی تو ہیں کہ جن کی وجہ سے زندگیوں کا حقیقی سکون تباہ و برباد ہو گیا ہے اور مسلمانوں کو احساس ہی نہیں ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جو امانت سونپی تھی، اس کا خیال نہیں رکھا، اور پھر مسلمات کو بھی ذمہ داری کا شعور نہیں ہے کہ (معمولی فرق کے ساتھ) وہ بھی برابر کی شریک ہیں اس کارِ عظیم میں کہ جسے بطور امانت مخلوقات کے سامنے پیش فرمایا تو حضرت انسان نے اس بوجھ کو اُٹھا لیا۔

vii) **اپنے دشمنوں کو پہچاننے والی:** جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید نے یہود و نصاریٰ، مشرکین و منافقین کو مؤمنین کا دشمن قرار دیا ہے۔ نیز شیطان کے بارے میں تاکید آئی ہے کہ: ﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّا فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ﴾ (فاطر:٦) ''یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے، پس اسے دشمن ہی سمجھو'' جبکہ آج اس کے برعکس نہ صرف مسلمان مرد بلکہ مسلمان عورتیں بھی شیطانی نظریات و افکار اور بُرے اعمال کو promote کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

آخر میں میری پیاری بہنوں سے درخواست ہے کہ خدارا ابھی وقت ہے، غفلت کی نیند سے جاگیں اور اپنی اوّلین اور اہم ترین ذمہ داریوں کو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات اور سنت رسول ﷺ کے مطابق ادا کریں تاکہ آخرت میں رسوائی سے بچیں اور سرخروئی حاصل ہو۔

مضمون کی تیاری کے لیے درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

(۱) المرأة المسلمة ومسئولياتها فی الواقع المعاصر، تاليف : الاستاذ الدكتور: فالح بن محمد فالح

(۲) مثالی مسلمان عورت (کتاب وسنت کی روشنی میں) تالیف: ڈاکٹر محمد علی الہاشمی

❁ ❁ ❁

مقامِ حدیث

عبدالرشید عراقی

مضمون کے آغاز میں حدیثِ نبویؐ کے مقام و مرتبہ کے بارے میں چند اکابر علمائے اُمت کی تحریروں سے اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ (م ۱۹۵۳ء)

علم القرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علمِ حدیث شہ رگ کی۔ یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام جوارح تک خون پہنچا کر ہر آن ان کے لیے تازہ زندگی کا سامان پہنچاتا رہتا ہے۔ آیات کا شانِ نزول اور ان کی تفسیر، احکام القرآن کی تشریح و تعیین، اجمال کی تفصیل، عموم کی تخصیص، مبہم کی تعیین سب علمِ حدیث کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح حامل قرآن محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور حیاتِ طیبہ، اخلاق و عاداتِ مبارکہ اور آپ ﷺ کے اقوال و افعال اور آپؐ کے سنن و مستحبات اور احکام و ارشادات اسی علم حدیث کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح خود اسلام کی تاریخ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال اور ان کے اعمال و اقوال اور اجتہادات و استنباطات کا خزانہ بھی اسی کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس بنا پر اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اسلام کے عملی پیکر کا صحیح مرقع اسی علم کی بدولت مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے موجود و قائم ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ تا قیامت رہے گا۔ (۱)

مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ (م ۱۹۷۴ء)

کلام مجید اگرچہ ایک واضح اور کھلی ہوئی کتاب ہے اور اس میں کوئی غموض و خفا نہیں ہے، لیکن اس میں اسلام کی تعلیمات کی پوری تفصیل اور تمام جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے بہت سے احکام مجمل یا کلیات کی شکل میں ہیں جن کی وضاحت و تشریح اور کلیات سے جزئیات کی تفریع رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و عمل سے فرمائی۔ آپ ﷺ کا کام محض کلامِ الٰہی لوگوں تک پہنچا دینا نہیں تھا، بلکہ اس کی تبیین و تشریح بھی تھی۔ (۲)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (م ۱۹۹۹ء)

حدیث نبوی ایک ایسی میزان ہے جس میں ہر دور کے معلّمین و مجدّدین اس اُمت کے اعمال، عقائد، رجحانات اور خیالات کو تول سکتے ہیں اور اُمت کے طویل تاریخی عالمی سفر میں پیش آنے والے تغیرات اور انحرافات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اخلاق و اعمال میں کامل اعتدال و توازن اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک قرآن و حدیث کو بیک وقت سامنے نہ رکھا جائے۔ اگر حدیث نبوی کا وہ ذخیرہ نہ ہوتا جو معتدل اور کامل و متوازن زندگی کی صحیح نمائندگی کرتا ہے اور اگر وہ حکیمانہ تعلیمات نہ ہوتیں جن کی پابندی رسول اللہ ﷺ نے اسلامی معاشرہ سے کرائی تو یہ امت افراط و تفریط کا شکار ہو کر رہ جاتی اور اس کا توازن برقرار نہ رہتا اور وہ عملی مثال موجود نہ رہتی جس کی اقتدا کرنے کی اللہ تعالیٰ نے اس فرمان میں ترغیب دی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

''یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ) کی ذات اُسوۂ حسنہ ہے۔''

اور اس کے بعد یہ ارشاد فرما کر آپ ﷺ کے اتباع کی دعوت دی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱﴾ (آل عمران)

''آپ (ﷺ) کہہ دیجیے اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا، اور اللہ بہت بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

یہ ایک ایسا عملی نمونہ ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے اور جس سے وہ زندگی اور قوت و اعتماد حاصل کر سکتا ہے اور یہ اطمینان کر سکتا ہے کہ دینی احکام کا زندگی پر نفاذ نہ صرف آسان بلکہ امرِ واقعہ ہے۔

حدیث نبوی ﷺ زندگی، قوت اور اثر انگیزی سے بھرپور ہے اور ہمیشہ اصلاح و تجدید کے کام، فساد اور خرابیوں اور بدعتوں کے خلاف صف آراء اور برسرِ جنگ ہونے اور معاشرہ کا احتساب کرنے پر اُبھارتی رہی ہے۔ اور اس کے اثر سے ہر دور و ہر ملک میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے، جنہوں نے اصلاح و تجدید کا جھنڈا بلند کیا، کفن بردوش ہو کر میدان میں آئے،

بدعتوں اور خرافات اور جاہلی عادتوں سے کھلی جنگ کی' اور دین خالص اور اسلام کی دعوت دی۔ اس لیے حدیثِ نبویؐ امتِ اسلامیہ کے لیے ایک ناگزیر حقیقت اور اس کے وجود کے لیے ایک لازمی شرط ہے۔ اس کی حفاظت' ترتیب وتدوین' حفظ اور نشرواشاعت کے بغیر امت کا دینی اور ذہنی واخلاقی دوام وتسلسل برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ (۳)

مولانا بدر عالم میرٹھیؒ (م ۱۹۶۵ء)

سنت کیا ہے؟ وہ درحقیقت قرآن ہی کی ایک مفصل شکل ہے' اس کے مجملات کی تفصیل اور اس کے مشکلات کا بیان اور اس کے مختصرات کی شرح ہے۔ مجملات کی تفصیل سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم میں روزہ' نماز' حج اور زکوٰۃ بلکہ تمام عبادات ومعاملات کی کوئی تفصیل ذکر نہیں کی گئی' سنت نے اس اجمال کی تفصیل کی ہے۔ قرآن نے اگر نماز کا حکم دیا ہے تو سنت نے اس کی ایک ایک چیز کی تفصیل کی ہے۔ (۴)

قرآن کی حیثیت متن اور سنتِ مطہرہ اس کی شارح ہے

آنحضرت ﷺ کا کام محض کلام الٰہی کو لوگوں تک پہنچا دینا نہ تھا' بلکہ اس کی تبیین وتشریح بھی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النحل میں اس کی وضاحت فرمائی ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾

''یہ ذکر (کتاب) ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے تاکہ لوگوں کی جانب جو نازل فرمایا گیا ہے آپ (ﷺ) اسے کھول کھول کر بیان کر دیں شاید کہ وہ غور وفکر کریں۔''

یہ آیت مبارکہ اس بات کو واضح کرتی ہے کہ آپ ﷺ کی ذمہ داری یہ ہے کہ قرآن کی آیات کی تشریح وتبیین فرمائیں تاکہ لوگ ان میں غور وفکر کر کے ہدایت کی راہ پر گامزن ہوں اور فلاح دارین حاصل کریں۔

حدیث کی تشریعی حیثیت

قرآن وحدیث کا ربط معلوم کرنے کے بعد اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ حدیثِ نبوی کی حیثیت تشریعی ہے' کیونکہ احادیث کا تمام ذخیرہ قرآن کریم کا بیان اور اس کی شرح ہے۔ پس اگر قرآن کی حیثیت تشریعی ہے تو اس کے بیان کی حیثیت بھی تشریعی ہونی چاہیے۔ یہی عقیدہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک تمام امت کا ہے۔ قرآن مجید اپنے ماننے والوں

سے مطالبہ کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل کو وہ عینِ دین سمجھیں اور نبی ﷺ کے طرزِ زندگی ہی کو اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ طریقہ حیات تسلیم کریں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (آل عمران)

''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو' اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا' اور اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

حدیث' قرآن کی ہی شرح ہے

قرآن مجید باوجود اپنی جامعیت اور جملہ ضروریہ پر حاوی ہونے کے زیادہ تر ایمان و عقائد اور اصول دین بیان کرتا ہے اور قرآن مجید کی حیثیت ایک بنیادی قانون اور دستورِ اساسی کی ہے۔ اس کو تفصیلی شکل دینا اور اس کی دفعات کی وضاحت کرنا دراصل حدیث کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کام خود رسول اللہ ﷺ کے سپرد کیا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ٤٤)

''اور آپ پر ہم نے قرآن نازل کیا ہے تاکہ لوگوں کے لیے جو کچھ نازل کیا گیا ہے اسے آپ ان کے لیے کھول کر بیان کر دیجیے۔''

جو متن خود اپنے بیان کے مطابق محتاجِ شرح ہو' اگر اس کی شرح ضائع ہو جائے تو بلاشبہ وہ متن' باوجود یکہ اس کا ایک ایک حرف محفوظ ہے' اپنا مفہوم واضح نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن عبدالبر قرطبی رحمہ اللہ جامع بیان العلم وفضلہ میں لکھتے ہیں:

''امام اوزاعی نے امام مکحول سے نقل کیا ہے: الکتاب احوج الی السنة من السنة الی الکتاب ''کتاب اللہ سنت کی اس سے کہیں زیادہ محتاج ہے جتنی کہ سنت کتاب اللہ کی محتاج ہے۔'' (۵)

علمائے اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ سنت قرآن مجید کی شرح وتفسیر ہے۔ امام شاطبی رحمہ اللہ اپنی کتاب 'الموافقات' میں لکھتے ہیں:

فکان السنة بمنزلة التفسیر والشرح لمعانی احکام الکتاب

''پس گویا سنت کتاب اللہ کے احکام کے لیے بمنزلہ تفسیر اور شرح ہے۔'' (۶)

ملا علی قاری (حنفی) مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں:

''دنیا اور عقبیٰ کی کامیابی کا راز کتاب اللہ کی تابعداری میں مضمر ہے اور کتاب اللہ کی تابعداری نبی ﷺ کی سنت کی معرفت (آپ ﷺ کے طرزِ زندگی کو پہچاننے اور اس پر عمل پیرا ہونے) پر موقوف ہے۔ پس کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ از روئے شریعت باہم دگر لازم وملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔''

علامہ شاطبی رحمہ اللہ الموافقات میں فرماتے ہیں:

لیس فی السنة الا و أصله فی القرآن

''سنت میں ایسا کوئی بیان نہیں ہے جس کی اصل قرآن مجید میں نہ ہو۔''

بغیر حدیث بعض آیاتِ قرآن کا مفہوم تشنہ ہے!

اگر حدیث نبوی ﷺ کو پس پشت ڈال دیا جائے اور یہ پروپیگنڈا کیا جائے کہ ہمیں قرآن مجید ہی کافی ہے تو ایسا پروپیگنڈا کرنے والے جاہل ہیں۔ ان کا یہ خیال اور انداز صحیح نہیں ہے' کیونکہ بہت سی آیات قرآنی کا مطلب حدیث نبویؐ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝﴾ (الحجر)

''بلاشبہ ہم نے آپ کو سات دہرائی جانے والی آیات عطا کی ہیں (جن کو نماز میں مکرر پڑھا جاتا ہے) اور عظمت والا قرآن مجید بھی عطا کیا ہے۔''

حدیث اس کی وضاحت کرتی ہے کہ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ سورۃ الفاتحہ ہے۔(۷)

قرآن مجید کی بہت سی ایسی آیات ہیں جن کا مفہوم ومطلب حدیث کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ مثلاً:

سورۃ البقرۃ (آیات ۵۹۔۲۰۴۔۲۰۷۔۲۳۸۔۲۵۸۔۲۵۹)

سورۃ الانفال (آیات ۷۔۴۲)

سورۃ التوبہ (آیات ۴۰۔۴۹۔۵۸۔۱۰۸۔۱۱۸)

سورۃ النحل (آیت ۴۳)

سورۃ الاحزاب (آیات ۱۳۔۲۶۔۲۷)

سورۃ الاحقاف (آیت ۱۰)۔ سورۃ المجادلہ (آیت ۱)

سورۃ التحریم (آیت ۳) سورۃ عبس (آیات ۱۔۲)

اہمیتِ حدیث

حدیث کی اشاعت اور اس کے جمع وتدوین کی ابتدا کی تفصیل یہ ہے کہ چونکہ یہ علم احکامِ شرعیہ کی بنیاد اور اس کے اصول کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے ثقہ علمائے کرام نے اس کی طرف زیادہ توجہ کی اور روایت و درایت کا سلسلہ شروع ہوا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام کے نزدیک اس علم سے زیادہ اور کوئی علم افضل نہیں۔ اس لیے انہوں نے اس کی طرف خاص توجہ کی اور صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام نے اس علم کے حاصل کرنے کے لیے دور دراز کے سفر کیے۔ محدّثین ذی وقار نے طلبِ حدیث کے سلسلہ میں بہت کوششیں کیں' دور دراز ممالک کے سفر کیے' صعوبتیں اور تکالیف برداشت کیں۔ ان تمام باتوں سے تاریخ کا ایک طالب علم بخوبی واقف ہے۔ جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہو گیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مختلف شہروں میں جا بسے اور آہستہ آہستہ دنیا سے رخت سفر باندھنے لگے تو علمائے اسلام نے تدوین حدیث کی طرف توجہ کی اور حدیث کے جمع وتدوین کا بیڑا اٹھایا۔

حجیتِ حدیث

منکرینِ حدیث' حدیثِ نبوی ﷺ کو حجت تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہمیں قرآن مجید کافی ہے۔ ان کا یہ دعویٰ سراسر باطل ہے۔ حدیث نبوی ﷺ دین اسلام میں حجت ہے۔ علمائے اسلام نے لکھا ہے کہ:

''جب نبی ﷺ سے کسی حدیث کا صادر ہونا ثابت ہو جائے تو اس کے حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں' کیونکہ سند کی صحت کے باوجود اگر حدیث کو حجت نہ مانا جائے تو اس سے پورے دین کا انکار لازم آئے گا۔''(۸)

آنحضرت ﷺ کے ذمہ صرف آیاتِ قرآن کی تلاوت وتبلیغ نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کا تزکیہ وتعلیم بھی تھا' اور آپ ﷺ ان کو کتاب اللہ کے ساتھ حکمت کی بھی تعلیم دیتے تھے۔ یہ حکمت قرآن مجید اور وحی خفی سے ماخوذ ہے۔ یقیناً آنحضرت ﷺ کی ذات بابرکات اور آپ ﷺ کا ہر قول وفعل مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی وضاحت فرمائی ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ

الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾ (الاحزاب)

''تمہارے لیے اللہ کے رسول (ﷺ) کے طرزِ زندگی میں بہترین نمونہ ہے اس کے لیے جو اُمید رکھتا ہے اللہ اور آخرت کے دن کی اور اللہ کو بہت زیادہ یاد رکھتا ہے۔''

اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی بھی سخت تاکید کی ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ''اَطِيْعُوا اللّٰهَ'' کے ساتھ ساتھ ''اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا بھی حکم ہے۔

(۱) ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٣٢﴾﴾ (آل عمران)

''اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

(۲) ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴿٣٣﴾﴾ (محمد)

''مسلمانو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال ضائع مت کرو۔''

(۳) ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (النساء:٦٤)

''ہم نے جو بھی رسول بھیجا ہے وہ اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم کے تحت اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے۔''

(۴) ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء:٨٠)

''جس نے رسول کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿٣﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿٤﴾﴾ (النجم)

''وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا' یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔''

منکرینِ حدیث' حدیث کا انکار کرتے ہیں اور اس کو حجت تسلیم نہیں کرتے اور اپنے آپ کو ''اہلِ قرآن'' کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ ان کی ہٹ دھرمی ہے اور کم علمی کا ثبوت ہے۔

ایک مغربی مستشرق ''طامس کارلائل'' اپنی کتاب ''ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ'' میں لکھتا ہے:

''محمد (ﷺ) ایک سرگرم اور پرجوش ریفارمر تھے' جن کو خدا نے گمراہوں کی ہدایت کے لیے مقرر کیا تھا۔ ایسے شخص کا کلام خود خدا کی آواز ہے۔ محمد (ﷺ) نے انتھک کوشش کے ساتھ حقانیت کی خواہش کی اور زندگی کے آخری لمحے تک اپنے مقدس مشن کی تبلیغ جاری رکھی۔''(۹)

درحقیقت اسلام کی پوری عمارت قرآن مجید اور حدیث نبوی ﷺ پر قائم ہے۔ حدیث کلام مجید کی تفسیر بھی ہے اور اس کے اجمال کی تفصیل بھی' اس کے کُلّی احکام سے جزئیات کی تفریع بھی ہے اور اسلام کے قرنِ اوّل کی تاریخ بھی۔ اس کے بغیر اسلام کی تعلیم اور اس کی ابتدائی تاریخ کے بہت سے اوراق سادہ رہ جاتے ہیں۔

اسلام کے ارکانِ اربعہ نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی احکام بھی نہیں معلوم ہو سکتے اور نہ ان کو حدیث کے بغیر ادا کیا جا سکتا ہے۔ ان کے صرف کُلّی احکام قرآن مجید میں ہیں' اس کی تفصیل حدیث و سنت سے معلوم ہوتی ہے۔ یہی احوال اکثر اوامر و نواہی اور حلال و حرام کا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت' اسلام کا ظہور' اس کی تبلیغ' اس راہ کی صعوبتیں' غزوات' اسلام کا غلبہ و اقتدار' حکومت الٰہیہ کا قیام' اس کا نظام' رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور آپؐ کی سیرت معلوم کرنے کا ذریعہ صرف حدیث ہے۔ اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو اسلام کی بہت سی تعلیمات اور تاریخ اسلام کے بہت سے گوشے مخفی رہ جائیں گے۔ اس لیے احادیث نبوی اسلام اور اسلامی تاریخ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں اور ان پر اس کی عمارت قائم ہے۔

اگر قرآن مجید کو تسلیم کیا جائے اور حدیث کا انکار کیا جائے تو یہ ایسا ہی ہے کہ کسی کلام کو تسلیم کر لیا جائے اور اس کے مفہوم کا انکار کر دیا جائے۔

اصلِ دین آمد کلام اللّٰہ معظّم داشتن
پس حدیثِ مصطفٰی بر جاں مسلّم داشتن

کتابتِ حدیث

منکرینِ حدیث بڑے زور شور سے یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتابتِ حدیث سے منع فرمایا تھا اور اس پر اپنے فاسد خیالات کی بنیاد رکھتے ہیں۔ مذکورہ حدیث درج ذیل ہے:

عَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ : كُنَّا قُعُوْدًا نَكْتُبُ مَا نَسْمَعُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ فَخَرَجَ عَلَيْنَا فَقَالَ : ((مَاهٰذَا تَكْتُبُوْنَ؟)) فَقُلْنَا : مَا نَسْمَعُ مِنْكَ، فَقَالَ :((أَكِتَابٌ مَعَ كِتَابِ اللّٰهِ؟ اَمْحِضُوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَاَخْلِصُوْهُ)) قَالَ: فَجَمَعْنَا مَا كَتَبْنَاهُ فِيْ صَعِيْدٍ وَاحِدٍ ثُمَّ اَحْرَقْنَاهُ بِالنَّارِ (۱۰)

''حضرت ابوسعید خدری ؓ فرماتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا اسے بیٹھ کر لکھ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: ''تم لوگ یہ کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ جو کچھ بھی آپ ﷺ سے سنا ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا: ''کیا کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ ایک اور کتاب لکھی جا رہی ہے؟ اللہ کی کتاب کو علیحدہ کرو اور خالص کرو''۔ پس ہم نے جو کچھ بھی لکھا تھا ایک جگہ جمع کر کے نذرِ آتش کر دیا۔''(۱۰)

مذکورہ بالا حدیث کے بارے میں مولانا سید منت اللہ شاہ رحمانیؒ لکھتے ہیں:

''صورتِ حال یہ تھی کہ قرآن مجید تھوڑا تھوڑا نازل ہو رہا تھا۔ کچھ سورتیں یا آیتیں آج نازل ہوئیں کچھ کل۔ رسول اللہ ﷺ کسی سورت یا آیت کے نزول کا اعلان فرماتے۔ صحابہ کرام ؓ ان ساری چیزوں کو ایک ہی کاغذ پر لکھ لیا کرتے' جیسا کہ منع کتابت والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ سے دریافت فرمایا کہ تم یہ کیا لکھ رہے ہو تو انہوں نے عرض کیا کہ جو کچھ بھی آپ ﷺ سے سنتے ہیں۔ اس میں قرآن و حدیث کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ نبی ﷺ کی دور بیں نگاہ اس کو کب گوارا کر سکتی تھی کہ صحابہ کرام ؓ کے ہاتھوں کوئی ایسی چیز عمل میں آئے جس کی بنیاد پر زائغین کو کلام اللہ کی حفاظت کے سلسلہ میں موشگافیاں کرنے کا موقع حاصل ہو جائے اور آنے والی نسل کے لیے احکامِ خداوندی اور احکامِ نبوی میں خلط ملط کا شبہ پیدا ہو' جس کی بنیاد پر دین کے رخنہ انداز کلامِ الٰہی میں بھی اس قسم کی چہ میگوئیاں شروع کر دیں جس طرح آج کل احادیث نبوی ؐ کے بارے میں کر رہے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جب دونوں چیزیں ایک ساتھ لکھی جائیں گی تو پھر اس میں امتیاز کرنا کہ اس میں کون سا حصہ قرآن مجید کا ہے اور کون سا ٹکڑا حدیث کا ہے مشکل ہو جائے گی۔ اور یہ چیز بڑی خطرناک ہوتی کہ اللہ اور اس کے رسول کے کلام میں کوئی فرق نہ رہے۔ دونوں کو ایک ساتھ اس طرح لکھا جائے کہ تمیز مشکل ہو۔

چنانچہ صحابہ کرام ؓ نے عرض کیا کہ جو کچھ بھی ہم آپ ﷺ سے سنتے ہیں لکھ لیتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے تعجب سے فرمایا کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ ساتھ ایک اور کتاب لکھی جا رہی ہے' یعنی اللہ کی کتاب کے ساتھ ایک دوسری کتاب کا اس طرح لکھنا کہ دونوں میں امتیاز باقی نہ رہے' کسی طرح روا نہیں۔ آپ ﷺ نے اظہارِ تعجب کے بعد یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ دوسری کتاب نہ لکھو۔ بلکہ یہ ارشاد ہوا:

((اَمْحِضُوْا کِتَابَ اللّٰہِ وَاَخْلِصُوْہُ))

''اللہ کی کتاب کو علیحدہ کرو اور خالص کرو۔''

دوسری کتاب کے ساتھ ملا کر نہ لکھو۔ حضرت ابوسعید خدری ؓ فرماتے ہیں کہ اس حکم کے بعد ہم نے جو کچھ بھی قرآن و حدیث ملا کر لکھا تھا جمع کیا اور جلا دیا۔

منع کتابت والی حدیث کا یہ صاف اور کھلا ہوا مطلب ہے۔ اس حدیث سے یہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث کی کتابت کو مطلقاً منع فرما دیا تھا کہ اب اس کے بعد کسی صحابی کو حدیث لکھنے کی جرأت نہ کرنی چاہیے تھی۔ بلکہ اس کے الفاظ صاف طور سے بتلاتے ہیں کہ اس میں کتابت کے اس طریقہ سے روکا گیا ہے جس میں قرآن و حدیث کا باہمی فرق و امتیاز ختم ہو جاتا ہے اور اس لیے کہ صحابہ کرام ؓ کاغذ وغیرہ کی کمی یا کسی اور وجہ سے دونوں کو ایک ہی کاغذ پر ساتھ ساتھ لکھتے جاتے تھے۔''

مولانا سید منت اللہ شاہ رحمانی اس کے بعد لکھتے ہیں کہ میرے اس بیان کی تائید حضرت ابو بردہؓ بن ابی موسیٰ اشعریؓ کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ:

''میں نے اپنے والد سے ایک کتاب نقل کی تھی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر اس میں اللہ کی کتاب نہ ہوتی تو میں جلا دیتا' پھر ایک برتن میں پانی منگوا کر اس کو دھویا۔(۱۱)

معلوم ہوا کہ دوسری کتاب کلام اللہ کے ساتھ ایک ہی کاغذ پر لکھی ہوئی تھی۔ جب تو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ اگر اس کتاب میں اللہ کی کتاب لکھی نہ ہوتی تو میں جلا دیتا۔ لیکن کلام اللہ کا احترام کتاب کو جلانے سے روکتا ہے اس لیے پانی سے اس کو مٹا دیا۔ پھر جب کلام اللہ اور حدیث رسول ﷺ کا فرق صحابہ کرام ؓ کے ذہن نشین ہو گیا اور ایک ساتھ لکھی ہوئی کتابیں ضائع کر دی گئیں اور یہ یقین ہو گیا کہ صحابہ کرام ؓ قرآن و حدیث کو ایک ساتھ ایک ہی کاغذ پر نہ لکھیں گے تو پھر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو کتابتِ حدیث کی اجازت دی اور صحابہ کرام ؓ نے احادیث کو قلمبند کیا۔(۱۲)

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں مکتوباتِ نبوی' معاہداتِ نبوی' مسائل نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج و صدقات وغیرہ لکھے جاتے تھے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا وہ اسلام کے سیاسی احکام پر مشتمل تھا۔ اس خطبہ کے بارے میں ایک صحابی ابوشاہ یمنی ؓ نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے یہ خطبہ لکھ کر دیا جائے۔ آپ ﷺ نے حکم دیا: ((اُکْتُبُوْا لِاَبِی شَاہ)) ''ابی شاہ کے لیے یہ خطبہ لکھ کر اس کے حوالہ کرو۔''(۱۳)

خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ حاضر ہیں وہ غیر حاضر لوگوں کو میری حدیثیں پہنچا دیں۔

((اَلَا لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ، فَلَعَلَّ بَعْضَ مَنْ يَبْلُغُهُ اَنْ يَكُوْنَ اَوْعٰى لَهٗ مِنْ بَعْضِ مَنْ سَمِعَهٗ)) (۱۴)

''سنو! جو موجود ہیں وہ یہ باتیں ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ جن کو یہ باتیں پہنچیں ان میں سے کچھ ان کی بہ نسبت ان کو زیادہ سمجھنے اور محفوظ رکھنے والے ہوں جنہوں نے (براہِ راست مجھ سے) سنی ہیں۔''

اسی کا نام روایت حدیث ہے۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ (م ۱۹۷۴ء) سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ لکھتے ہیں کہ:

''اس لیے عہدِ رسالت سے لے کر بعد کے ہر دور میں حدیث نبوی کی نقل و روایت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ حدیثیں پوری دنیائے اسلام میں بکھری ہوئی تھیں۔ محدثین کرام کا یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اس زمانہ میں جبکہ سفر کی سہولتیں نہ تھیں اور سفر ہم معنی سقر سمجھا جاتا تھا' اور نہ نشر و اشاعت کے موجودہ سامان تھے' تعلیم بھی محدود تھی' دنیائے اسلام کا چپہ چپہ چھان کر رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال یعنی حدیث و سنت کو تحقیق و صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ جمع و مرتب کیا' ان کے ردّ و قبول اور صحت و سقم کے جانچنے اور رواۃ کی جرح و تعدیل کے اصول بنائے' اصولِ حدیث کا مستقل فن ایجاد کیا' نیز ہزاروں راویانِ حدیث کے حالات صحت و تحقیق کے ساتھ قلمبند کیے' جو مسلمانوں کا بڑا قابلِ فخر کارنامہ ہے۔''(۱۵)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم کو مقید کر لو''۔ حضرت عبداللہ سے دریافت کیا گیا کہ مقید کرنے کا مطلب کیا ہے؟ فرمایا: لکھنا۔(۱۶)

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے حدیثوں کے یاد نہ رہنے کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اپنے ہاتھ سے مدد لو (یعنی لکھ لیا کرو)''۔(۱۷)

حضرت جابر اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہاتھ سے کام لینے کا حکم دیا۔(۱۸)

صحابہ کرامؓ کا احادیث کو جمع کرنا

جب آنحضرت ﷺ نے حدیث کی اشاعت کے لیے بڑی شدّ و مدّ سے ترغیب دی اور

احادیث کے لکھنے کا حکم صادر فرمایا تو پھر کس طرح ممکن تھا کہ صحابہ کرامؓ اس طرف توجہ نہ کرتے اور غفلت کرتے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ نے احادیث کی حفاظت اور اشاعت کے لیے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا اور دن رات ایک کر کے حدیثوں کو جمع کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں کہ عہد رسالتؐ میں صحابہ کرامؓ نے حدیثوں کا ایک بڑا حصہ ترتیب دے لیا تھا۔ احادیث کا جو ذخیرہ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں یا صحابہ کرامؓ کے عہد میں قلمبند ہوا' اس کے سلسلہ میں محدثین کرام نے تین ذرائع کی نشاندہی کی ہے:

(۱) احادیث کا وہ ذخیرہ جو خود آنحضرت ﷺ کے حکم سے قلمبند کیا گیا۔

(۲) وہ ذخیرہ جو صحابہ کرامؓ نے خود قلمبند کر لیا اور اس کی تصحیح کے لیے جناب رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں پیش کیا اور آپ ﷺ نے سننے کے بعد اس کی تصدیق اور توثیق فرمائی۔

(۳) وہ ذخیرہ جو صحابہ کرامؓ نے خود رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر یا صحابہ کرامؓ سے پوچھ کر رسول اللہ ﷺ کی حیات میں یا آپ ﷺ کے بعد قلمبند کیا۔

احادیث کا جو ذخیرہ خود رسول اللہ ﷺ کے حکم سے قلم بند کیا گیا' اس کے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات ملتی ہیں:

(ا) حضرت عبداللہ بن حکیمؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک تحریر ہمارے قبیلہ جہینہ کے پاس پہنچی' جس میں مختلف احادیث تھیں اور یہ حدیث بھی درج تھی کہ:
''مردار جانوروں کی کھال اور پٹھے بغیر پکائے کام میں نہ لاؤ۔''(۱۹)

(ب) رسول اکرم ﷺ نے ایک تحریر حضرت عمرو بن حزمؓ صحابی کے ذریعہ اہل یمن کے پاس بھیجی تھی۔ اس تحریر میں فرائض و سنن اور خون بہا کے متعلق مسائل تھے۔(۲۰)

(ج) حضرت وائل بن حجرؓ حضرموت کے رہنے والے تھے اور زمانہ رسالت کے آخری دور میں اسلام لائے تھے۔ جب اپنے وطن واپس جانے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے ایک صحیفہ لکھوا کر ان کے سپرد کیا جس میں نماز' روزہ' شراب' سود وغیرہ کے احکام تھے۔(۲۱)

(د) **کتاب الصدقہ**: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں زکوٰۃ کے موضوع پر ایک کتاب لکھوائی تھی جو مکمل ہو چکی تھی لیکن عاملوں کے پاس بھیجنے سے پہلے آپ ﷺ رحلت فرما گئے۔ حافظ ابن عبدالبر قرطبی

فرماتے ہیں کہ:

''آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زندگی بھر اس پر عمل کیا اور حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اس پر عمل کیا۔''(۲۲)

(۶) صحیفہ صادقہ: یہ مجموعہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہ کر مرتب کیا تھا اور وہ بتاتے تھے کہ میں نے یہ مجموعہ خود رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر لکھا ہے۔(۲۳)

اس صحیفہ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''مجھے زندگی کی چاہت صرف اس صحیفہ صادقہ کی وجہ سے ہے۔''

عہدِ نبوی میں مرتب شدہ صحیفے

عہد نبوی ﷺ میں مذکورہ بالا صحیفوں کے علاوہ جو صحیفے مرتب ہوئے' ان کی تفصیل درج ہے:

(۱) حضرت انس بن مالکؓ کے صحیفے	(۲) صحیفہ علی بن ابی طالبؓ
(۳) خطبہ حجۃ الوداع	(۴) صحیفہ جابر بن عبداللہؓ
(۵) مسند ابی ہریرہؓ	(۶) صحیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ
(۷) صحیفہ سمرہ بن جندبؓ	(۸) صحیفہ سعد بن عبادہؓ
(۹) صحیفہ عبداللہ بن عباسؓ	(۱۰) صحیفہ عبداللہ بن اَبی اوفیؓ
(۱۱) صحیفہ اسماء بنت عمیسؓ	(۱۲) صحیفہ محمد بن مسلمہ انصاریؓ (۲۴)

تابعین کے مرتب کردہ مجموعے

تابعین عظام نے بھی حدیث کے مجموعے مرتب فرمائے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے دو تلامذہ وہب بن منبہ اور سلمان بن قیس نے حدیث کے مجموعے مرتب فرمائے تھے۔(۲۵)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے تلمیذ رشید حضرت ہمام بن منبہ نے حدیث کا ایک مجموعہ مرتب فرمایا تھا جو صحیفہ ہمام بن منبہ کے نام سے معروف ہوا۔ یہ صحیفہ مسند احمد بن حنبل' جلد ۲' صفحہ ۳۱۲ تا ۳۱۸ میں مکمل درج ہے۔ صحیفہ ہمام بن منبہ علیحدہ طور پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی کی تحقیق' تخریج اور تنقیح و تعلیق سے شائع ہو چکا ہے' حدیث کی تعداد ۱۳۸ ہے۔ صحیفہ ہمام بن منبہ کا اردو

ترجمہ کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔ مترجم کا اسم گرامی رشید اللہ یعقوب ہے۔

احادیث کے ان کتابی ذخیروں کے علاوہ سینکڑوں کی تعداد میں وہ مکاتیب' معاہدے' امن نامے اور جاگیروں کے وثیقے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے لکھوا کر اور اس پر مہر ثبت کر کے بادشاہوں اور قبائل کے رؤسا کو بھیجے یا مختلف لوگوں کے حوالے کیے گئے۔ ان تمام مکاتیب و وثائق کو ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی نے جمع کر کے ''الوثائق السیاسۃ'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کا اردو ترجمہ مولوی ابو یحییٰ امام خان نوشہروی (م ۱۹۶۶ء) نے ''سیاسی وثیقہ جات'' کے نام سے کیا' جسے ۱۹۶۰ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے ۳۴۴ صفحات میں شائع کیا۔

تدوینِ حدیث

پہلی صدی ہجری کے اختتام تک اسلام عرب سے باہر عجم کے بہت سے ملکوں پر حکمران تھا۔ لوگ بکثرت دینِ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ نئے نئے مسائل اور نئے حالات سے مسلمانوں کا سابقہ تھا۔ اس وقت فوری ضرورت تھی کہ حدیث و سنت کے سرمایہ کو جو صحابہ کرامؓ اور تابعین سے منتقل ہوتا چلا آ رہا تھا' مدون کیا جائے اور جو علم محدثین کے سینوں اور منتشر صحیفوں میں تھا' اسے محفوظ کیا جائے۔

اہلِ اسلام نے جتنا اہتمام آنحضرت ﷺ کے کلام کی حفاظت کے لیے کیا ہے آج تک روئے زمین پر کسی دوسری قوم نے اپنے پیشوا کے کلام کی حفاظت کے لیے نہیں کیا۔ اپنے پیشوا کے کلام کی حفاظت تو دور کی بات ہے وہ تو اپنے نبی پر نازل کردہ کتاب کی حفاظت نہ کر سکے۔ لیکن پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے جاں نثاروں نے آپ ﷺ کے اقوال ہی نہیں' بلکہ افعال بھی حتیٰ کہ ہر حرکت و سکون' اندازِ گفتگو اور طرزِ تکلم کو اس طرح محفوظ کیا ہے کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

پہلی صدی ہجری کے اختتام کے قریب وہ مبارک ہستیاں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) جنہوں نے براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے احادیث سنی تھیں' ان کے وجود سے بزمِ عالم خالی ہو رہی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اموی ۹۹ھ میں مسند خلافت پر فائز ہوئے۔ ان کا شمار مشہور تابعین عظام میں ہوتا ہے۔ ان کی ذات سرتاپا اسلام کا اعجاز اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک نشانی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ روافض' خوارج' اور قدریہ وغیرہ نئے نئے

فرقے سر اٹھا رہے ہیں جو دینِ اسلام کو سخت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ دینِ اسلام کی حفاظت کے پیشِ نظر اس وقت سخت ضرورت ہے کہ حدیث وسنت کی باقاعدہ تدوین کی جائے۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے قاضی ابوبکر بن حزم انصاری (م ۱۲۰ھ) گورنر مدینہ کو حدیث کی تدوین کی طرف توجہ دلائی اور ان کو لکھا:

انظر ما كان من حديث رسول الله ﷺ فاكتبه لي فاني خِفتُ دروس العلم وذهاب العلماء (۲۶)

''رسول اللہ ﷺ کی جو کچھ حدیثیں تم کو ملیں ان کو تحریری شکل میں لے آؤ، اس لیے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ علم مٹ جائے گا اور علمائے کرام رخصت ہو جائیں گے۔''

گورنر مدینہ کے علاوہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنی حکومت کے دوسرے گورنروں کے نام سرکلر جاری کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کو تلاش کر کے احاطہ تحریر میں لاؤ۔ مولانا عبدالحئی لکھنویؒ (م ۱۳۰۴ھ) اپنی کتاب موطا امام محمد کی شرح ''التعليق المُمجّد'' کے مقدمہ میں حافظ ابونعیم اصبہانی رحمہ اللہ کی تصنیف ''تاریخِ اصبہان'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

كتب عمر بن عبدالعزيز الى الآفاق انظروا حديث رسول الله ﷺ فاجمعوه

''حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دور دور ملکوں میں یہ حکم بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کو تلاش کر کے جمع کرو۔'' (۲۷)

چنانچہ تمام گورنروں اور علمائے کرام نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس فرمان کی تکمیل کی۔ حافظ ابن عبدالبر قرطبی نے اپنی کتاب (جامع بیان العلم وفضلہ) میں امام ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

امرنا عمر بن عبدالعزيز بجمع السنن فكتبناها دفتراً دفتراً فبعث الى كل ارض له عليها سلطان دفتراً

''حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ہمیں سنن کے جمع کرنے کا حکم دیا، پس ہم نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے، پھر انہوں نے ہر اُس سرزمین کو جہاں ان کی حکومت تھی، ایک دفتر بھیج دیا۔'' (۲۸)

چنانچہ منکرینِ حدیث کی طرف سے یہ اعتراض کہ حدیث کی تدوین کا کام عہدِ رسالت سے ۱۵۰ سال بعد شروع ہوا، حقیقت پر مبنی نہیں، بلکہ مخالفت برائے مخالفت کے اصول پر مبنی

ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب بنام مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''مسلمانوں کے اس فقرے کے معنی کہ حدیث کی تدوین ہجرت کے ڈیڑھ سو برس بعد ہوئی، اس کا مقصد یہ ہے کہ تصنیف وتالیف اور کتاب کی حیثیت میں، ورنہ محض تحریر و کتابت کی حیثیت سے زمانہ نبوی ہی میں اس کی جمع وتدوین کا آغاز ہو چکا تھا۔'' (۲۹)

مولانا محمد اسحٰق سندیلوی رحمۃ اللہ علیہ مصنف ''اسلام کا سیاسی نظام'' وسابق استاذِ تفسیر ندوۃ العلماء لکھنؤ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''تحقیق یہ ہے کہ تدوینِ حدیث کا کام خود نبی اکرم ﷺ کے زمانہ سے شروع ہو چکا تھا۔ خلفائے راشدین کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں یہ سلسلہ کلیتاً منقطع ہو گیا ہو۔'' (۳۰)

مولانا عبدالسلام ندویؒ (م ۱۹۵۶ء) لکھتے ہیں کہ:

''صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں فنِ حدیث مدون ہو چکا تھا اور عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہی اجزاء کو ایک مجموعے کی شکل میں جمع کیا۔'' (۳۱)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا کام کتابت حدیث کا آغاز کرنا نہیں تھا، بلکہ تحریری اور زبانی روایات کو تلاش کر کے تمام ممالک اسلامیہ کے حدیثی ذخیرہ کو یکجا جمع کرنا تھا اور تدوینِ حدیث کا جو کام اب تک انفرادی اور شخصی طور پر ہو رہا تھا اس کو قومی اور ملی پیمانے پر کرنا آپ کا مقصد تھا۔

حواشی

(۱) مقدمہ تدوین حدیث، از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

(۲) مقدمہ تذکرۃ المحدثین، از مولانا ضیاء الدین اصلاحی، جلد اوّل

(۳) تاریخ دعوت و عزیمت، ج۵، ص ۱۷۰

(٤) ترجمان السنة، ج۱، ص ۱۲۵

(۵) جامع بیان العلم، ج۲، ص ۱۶

(٦) الموافقات، ج٤، ص ۱۰

(۷) صحیح البخاری، تفسیر سورۃ الحجر

(۸) الاعتصام، لاہور ۲۹/اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص ۱۳

(۹) عصر جدید، ۱۸/اگست ۱۹۲۹ء بحوالہ الترغیب والترھیب مترجم، ج۱، ص ۹۲
(۱۰) مسند احمد، ح:۱۰۸۸۲
(۱۱) مجمع الزوائد للھیثمی، ج۱، ص ۶۰
(۱۲) کتابت حدیث، مطبوعہ دھلی، ۱۹۵۱ء، ص ۵۸ تا ۶۱
(۱۳) صحیح البخاری، کتاب العلم، ح:۶۴۸۶
(۱۴) صحیح البخاری، ح:۴۴۰۶
(۱۵) مقدمہ تذکرۃ المحدثین، ج۱، ص ۸
(۱۶) مجمع الزوائد، ج۱، ص۱۵۲
(۱۷) مجمع الزوائد ج۱، ص۱۵۲
(۱۸) کنزالعمال، ج۵، ص ۲۲۶
(۱۹) جامع الترمذی، ج۱، ص ۲۰۶
(۲۰) الترغیب والترھیب، مترجم ج۱، ص ۱۶۶
(۲۱) طبرانی صغیر، ص ۲۴۱، ۲۴۲
(۲۲) جامع بیان العلم، ج۱، ص ۱۷۱
(۲۳) سنن الدارمی، ص۷۸۔
(۲۴) کاروان حدیث، ص۲۲، ۲۳۔
(۲۵) تدوین حدیث، از مناظر احسن گیلانی، ص ۶۸
(۲۶) صحیح البخاری، کتاب العلم، باب کیف کان یقبض العلم
(۲۷) مقدمہ التعلیق الممجّد، ص ۱۴
(۲۸) سیرت عمر بن عبدالعزیز ازمولاناعبدالسلام ندوی، ص ۱۴۱
(۲۹) مکتوباتِ سلیمانی، ص۱۱۲۔ مکتوب نمبر۸۱
(۳۰) ماھنامہ الفرقان لکھنؤ، ذی قعدہ ۱۳۷۵ھ، ص ۳۷
(۳۱) اُسوہ صحابہ، ج۲، ص ۳۱۰

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

اولاد کی تربیت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ تعالیٰ نے والدین کے دل میں اپنی اولاد کے لیے بے انتہا محبت ڈال رکھی ہے۔ اسی محبت کے نتیجے میں وہ اولاد کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ایسا ان کے جائز وسائل سے ممکن نہ ہو تو اکثر لوگ اولاد کی خاطر ناجائز ذرائع سے بھی کمائی کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ وہ رشوت سے روپیہ اکٹھا کرتے ہیں' کاروبار میں جھوٹ بول کر کماتے ہیں' سودی کاروبار میں ملوث ہوتے ہیں' چوری اور بددیانتی کے ذریعے مال اکٹھا کرتے ہیں۔ ایسے والدین اولاد کی محبت اور ان کو آسائش پہنچانے کے لیے گناہ کے کام کرتے ہیں۔ اور یہ بھول جاتے ہیں کہ حرام کمائی ان کی عاقبت برباد کر دے گی۔

اولاد کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی خیر خواہی ہر وقت پیش نظر رہے' رزقِ حلال کے ذریعے ان کی پرورش کی جائے' جائز آمدنی ہی ان کی ضروریات پر خرچ کی جائے۔ مشہور ہے کہ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جائیں۔ اگر اولاد کی پرورش حرام کمائی سے کی جائے گی تو یہ نہ ان کے لیے اچھی ہوگی اور نہ والدین کے لیے۔ کیونکہ ہر شخص سے یہ سوال کیا جائے گا کہ اس نے دولت کہاں سے کمائی اور کہاں خرچ کی؟ جو شخص اس سوال کا جواب نہ دے سکے گا وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب ہوگا۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں اس بات کا شعور نہیں دیا گیا تھا کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز؟ جن بچوں کو والدین حرام کمائی کھلاتے رہے ہیں وہ ان کے کسی کام نہ آسکیں گے۔ والدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی طور پر حرام کمائی نہ کمائیں' اپنے بچوں کو سادگی اختیار کرنے کی تعلیم دیں اور خود بھی سادگی پسند کریں۔ ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ آپؐ کو تکلفات سے نفرت تھی' آپؐ صرف وہی کام کرتے تھے جو آخرت کے لیے مفید ہو۔ اولاد کی تربیت میں سب سے اہم یہ ہے کہ

والدین اپنی اولاد کے لیے اچھا نمونہ پیش کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اولاد کی تربیت خود بخود اچھی ہوگی۔ جو باپ خود رشوت لیتا ہو' جھوٹ بولتا ہو' وعدے کی پابندی نہ کرتا ہو' اپنے فرائضِ منصبی میں بددیانتی کرتا ہو وہ اپنی اولاد کو کس طرح اچھے اخلاق کی تعلیم دے سکتا ہے اور توقع کر سکتا ہے کہ اس کے بچے بااخلاق اور باکردار ہوں؟ جو والدین سگریٹ پینے کے عادی ہیں وہ اپنے بچوں کو سگریٹ نوشی سے کیسے روک سکتے ہیں؟ اگر ایک والد بددیانت ہے تو اس کی اولاد کیسے دیانت دار ہو سکتی ہے؟

قرآنِ مجید میں ارشاد ہے: ﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم:٦) ''تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ''۔ یعنی خود بھی وہ کام کرو جو پسندیدہ اور جائز ہوں۔ اسی طرح اپنی اولاد کو اچھے کام کرنے کا حکم دو تاکہ جہنم کی آگ سے بچا جا سکے۔ والدین خود بھی عاقبت کی فکر کریں اور اولاد کو بھی یہ سبق دیں۔ جس باپ کی یہ خواہش ہو کہ اس کا بیٹا وافر کمائی کرے' جائز ناجائز کی پروا نہ کرے' وہ باپ بڑا نادان ہے۔ اولاد ماں باپ کے لیے صدقہ جاریہ ہے' لیکن ان والدین کے لیے جنہوں نے اسے نیکی کی تعلیم دی اور وہ نیکی کرتا رہا۔ ایسی اولاد نیک کام کرے گی تو والدین کو بھی ثواب پہنچتا رہے گا' خواہ والدین وفات بھی پا جائیں۔ لیکن جو والدین اپنے بچوں کو حرام کمائی کمانے پر لگا گئے ان کے بچے صدقہ جاریہ کی بجائے' ان کے لیے گناہوں کے انبار اکٹھے کر کے خود بھی عذاب اٹھائیں گے اور والدین کو بھی عذاب میں مبتلا کریں گے' کیونکہ انہوں نے ہی اپنے بچوں کو گناہ کے کاموں میں لگایا۔ یہ تو انسان کے فرض میں شامل ہے کہ وہ اپنی اولاد کو دوزخ کی آگ سے بچائے' یعنی نیک کام کرنے کی ہدایت کرے' نہ کہ خود انہیں دنیاوی مفاد کی خاطر ناجائز کام میں لگا دے۔

ہر مسلمان باپ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے بچے کو دین کی تعلیم دلوائے۔ دنیاوی علوم وفنون کی تعلیم بھی ضروری ہے لیکن اگر یہ تعلیم بچے کو دینی فرائض سے غافل کر دے تو بچہ خود بھی گمراہ ہوگا اور والد کو بھی گناہگار کرے گا۔ ماں باپ کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دیں اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ماں باپ خود بااخلاق ہوں۔ بچہ اگر سکول گیا اور وہاں سے کسی کی کوئی کاپی' کتاب یا پنسل لے آیا۔ ماں باپ نے وہ چیز دیکھ لی مگر بچے کو کچھ نہ کہا تو صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے اسے اچھا جانا۔ بات یہاں تک نہ رہے گی بلکہ یہ رویہ بچے

کو چور بنا دے گا اور اس کی ذمہ داری ماں باپ پر ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ)) یعنی تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور اسے اپنے ماتحتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اس نے اپنی ذمہ داری کہاں تک نبھائی۔ ایک افسر اگر خود رشوت نہیں لیتا لیکن اپنے عملے کو رشوت لینے سے نہیں روکتا تو وہ بھی رشوت خور ہی سمجھا جائے گا۔ رشوت خور کا بیٹا بھی حرام کمائی کمانے میں کوئی باک محسوس نہیں کرے گا۔

اگر والدین پنجگانہ نماز پڑھتے ہوں تو بچوں کو نماز کا عادی بنانے میں زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑے گی۔ بچیاں ہیں تو وہ گھر میں اپنی والدہ کے ساتھ شوق سے کھڑی ہو کر نماز پڑھیں گی۔ بچے اپنے باپ کے ساتھ مسجد جانا چاہیں گے بلکہ اکثر بچے تو ضد کریں گے کہ ہمیں بھی مسجد لے کر جائیں۔ جب بچپن ہی سے نماز کی عادت پڑ جائے گی تو ساری عمر نماز نہیں چھوٹے گی۔ قرآن مجید میں بارہا نماز کا حکم ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہے: ﴿وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا﴾ (آیت ۱۳۲) ''اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجیے اور خود بھی اس پر قائم رہیے''۔ نماز مؤمن کی نشانی ہے۔ اگر سربراہ خانہ ہی نماز نہ پڑھتا ہو تو وہ اپنی اولاد کو عملی طور پر یہ سبق دے رہا ہے کہ نماز پڑھنا ضروری نہیں۔ یہ ایک مثال ہے۔ شریعت کے کتنے ہی احکام ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہے' جب ماں باپ ہی ان کی پروا نہ کریں گے تو اولاد کیوں ان کو اہمیت دے گی۔ والدین اپنی اولاد کی دنیا سنوارنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں' مگر نہ انہیں اپنی آخرت کی فکر ہوتی ہے نہ اولاد کی۔ والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو دین کے احکام سے واقف کریں۔ اگر بیٹے نے ایم بی بی ایس کر لیا' انجینئر ہو گیا' پروفیسر بن گیا یا کوئی اور اعلیٰ ڈگری حاصل کر لی تو اس کا کچھ فائدہ نہیں اگر وہ دینی فرائض سے غافل رہا' بلکہ ایسے شخص کی زیادہ باز پرس ہوگی کہ اس نے اپنی صلاحیتوں کو صرف دنیا کمانے کے لیے لگایا' دین کے احکام کیوں نہ سیکھے۔ کامیاب انسان وہ ہے جو اپنے بچوں کو دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دین کے ضروری احکام سے بھی بہرہ ور کرے۔ شروع ہی سے اس کے ذہن میں یہ بات ڈالے کہ دنیا دارالعمل ہے۔ اگلا جہان وہ ہوگا جس میں دنیا کی زندگی میں کیے گئے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ وہاں بڑی بڑی ڈگریوں کی کوئی وقعت نہ ہوگی' وہاں صرف نیک اعمال کام آئیں گے۔

مختصر یہ کہ اولاد کی اچھی تربیت کے لیے ضروری ہے کہ:

(۱) والدین رزقِ حلال کا اہتمام کریں اور اپنی اولاد کو بھی اس پیشے میں ڈالیں جہاں رزق حلال کمانا آسان ہو۔

(۲) خود اخلاقی خوبیوں کے حامل ہوں اور ہر طرح کے برے اخلاق سے باز رہیں۔

(۳) اپنی اولاد کو دینی تعلیم سے محروم نہ رکھیں' ورنہ اولاد پڑھ لکھ کر بھی جاہل رہے گی۔

(۴) خود نماز روزے کی پابندی کریں اور دوسری تمام عبادات ذوق وشوق سے ادا کریں۔

(۵) حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کا بھی دھیان رکھیں۔ کسی کی حق تلفی نہ کریں۔

(۶) والدین کے لیے ضروری ہے کہ جب ان کا بچہ سکول کا طالب علم ہو یا اپنے دوستوں اور ہمجولیوں کے ساتھ کھیلے کودے تو خبردار رہیں کہ اس کے ساتھی کیسے ہیں۔ اگر اس کے ساتھی شریف اور نیک ہیں تو ان کا بچہ بھی ویسا ہی ہوگا اور اگر اس کے دوست سگریٹ نوش یا آوارہ قسم کے ہوں تو ان کا بچہ بھی ویسا ہی ہو جائے گا۔

❀❀❀

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
☆ اردو اور انگریزی کتابیں
☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس' سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

دہشت گردی کا مذہب

محمد ندیم پشاوری ☆

نئے سال کی پہلی صبح امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے پاکستان کے بارے میں ٹویٹ کیا جس میں کہا گیا: ''امریکہ نے پاکستان کو آخری پندرہ سالوں میں ۳۳ ارب ڈالر کی امداد دی ہے' جس کے بدلے پاکستان نے امریکہ کو دھوکے اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں دیا۔ پاکستان نے دہشت گردوں کو پناہ دے رکھی ہے اور ہمارے لیڈروں کو بیوقوف سمجھ رکھا ہے۔''

ڈونلڈ ٹرمپ کا سارا بیانیہ انتہائی آسان الفاظ پر مبنی ہے' لیکن ایک لفظ ''دہشت گردی'' جو اسم فاعل کے صیغے کے ساتھ استعمال ہوا ہے انتہائی مبہم اور غیر واضح ہے۔ دہشت گردی کیا ہے؟

آج کی دنیا میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ ''دہشت گردی'' ہے۔ انٹرنیٹ انسائیکلوپیڈیا بتاتا ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں آج یہ سب سے زیادہ لکھا اور پڑھا جانے والا لفظ ہے جو کرۂ ارض کی ہر زبان میں ترجمے کی صورت گردش کر رہا ہے۔ اخبارات' ریڈیو' ٹیلی ویژن ہر جگہ آپ کو اس لفظ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ لفظ ہماری سماجی زندگی کی گفتگو میں ہر طرح سے دخیل ہے۔ دنیا بھر کے اسکولوں' کالجوں میں یہ ہر طالب علم کی زبان پر ہے۔ استادوں' صحافیوں' دانشوروں کی گفتگو کا محور یہی لفظ دہشت گردی ہے۔ انٹرنیٹ کی دنیا میں داخل ہوتے ہی آپ کا سامنا اس لفظ سے ہوتا ہے۔ آج یہ لفظ ''دہشت گردی'' بغیر کسی ٹھوس وضاحت اور تعریف کے عالمی طاقتوں کی اجارہ داری کی نذر ہو گیا ہے۔ کوئی بھی ملک' تنظیم' گروہ یا با اثر شخصیت اپنے ملک کو بین الاقوامی سطح پر ذلیل کر کے' اپنا ضمیر بیچ کر' اپنی عزت نیلام کر کے' اپنے ہی شہریوں کی نظر میں اپنے آپ کو رسوا کر کے اگر عالمی طاقتوں کے مفادات کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے تو اُس ملک اور گروہ کے جنگجو ''حریت پسند'' کہلاتے ہیں اور اعلیٰ عہدیداروں کو نوبل پرائز اور امن ایوارڈز دیے جاتے ہیں اور خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے — لیکن اگر کسی کا

☆ ای میل: nts14303@gmail.com

مردہ ضمیر بیدار ہو جاتا ہے' اپنے ملک کو ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں شامل کرنے کے لیے منصوبہ بندی اور دیگر اقوامِ عالم سے معاہدے کیے جاتے ہیں' خیرات کا کشکول توڑ کر معیشت کو مستحکم کرنے کا ارادہ کیا جاتا ہے' ملک کو دہشت گردی سے پاک کرنے کے لیے اقدامات کیے جاتے ہیں' خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی جاتی ہے' اپنے ملک کے انفرادی اور اجتماعی مفادات کو عالمی طاقتوں کی چاپلوسی پر ترجیح دی جاتی ہے تو وہی لوگ جو پہلے عالمی طاقتوں کی نظر میں ''حریت پسند'' کہلاتے تھے وہی ''دہشت گرد' جھوٹے اور دھوکے باز'' کہلاتے ہیں۔

پاکستان ہی کی مثال لے لیجیے' برسوں سے لے کر آج تک تیل کے حصول کے لیے امریکی جنگ کو اپنی جنگ سمجھ کر فرنٹ لائن اتحادی کا رول ادا کیا' جس سے ہمارا اپنا ملک دہشت گردی کی زد میں آ گیا۔ مزید نقصان یہ ہوا کہ عالمی میڈیا میں پاکستان کو ''سٹیٹ آف ٹیرر'' قرار دے دیا گیا۔ تیل کے ذریعے امریکی معیشت کو جلا بخشنے کے لیے اپنے ہی ہاتھوں اپنی قوم کے نوجوانوں کو دہشت گردی کی آگ میں دھکیل دیا گیا' لیکن جب سٹیٹ آف ٹیرر کو State of Peace & Love میں تبدیل کرنے کا ارادہ کیا گیا تو ہم ''دھوکے باز اور جھوٹے'' ٹھہرے۔ افغانستان کی مثال لے لیجیے۔ روس کے ساتھ برسرِ پیکار افغان طالبان کو مالی تعاون کے ساتھ ساتھ امریکہ کی طرف سے سٹنگر میزائیل اور جدید قسم کا اسلحہ فراہم کیا جاتا رہا' جس کی مدد سے تقریباً دس سال تک بے سرو پا طالبان روس کے ساتھ زور آزمائی کرتے رہے' بالآخر روس انتہائی بری طرح شکست کھا کر اپنا بوریا بستر سمیٹ کر چلا گیا۔ روس کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے بعد ''ورلڈ ٹریڈ سنٹر'' کی تباہی کا افسانہ گھڑ لیا گیا اور وہی طالبان جو کبھی حریت پسند کہلاتے تھے' اسامہ بن لادن کو پناہ دینے کے الزام میں امریکی بربریت' درندگی اور سفاکی کا نشانہ بنے اور ''دہشت گرد'' کہلائے۔

امریکہ کو اپنے علاوہ تمام مسلم دنیا بالخصوص پاکستان ''دہشت گرد'' دکھائی دیتا ہے اور کیوں نہ دکھائی دے کہ امریکہ بار بار انسانیت سوز مظالم اور درندگی کا مظاہرہ کرتے دکھائی دے رہا ہے' اور کسی بھی ملک کے لیے جو غلط راہ پر چل پڑے مسلمان ملک و ملت سے خائف ہونا ایک فطری امر ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کے لیے غلط کام کرنے پر ایک خوف ڈال دیا ہے۔ اسی خوف کے زیرِ اثر صدر ڈونلڈ ٹرمپ یا کسی بھی شخص کا

پاکستان کو دہشت گرد کہنا اچنبھے کی بات نہیں۔ اس کو آپ ایک مثال سے یوں سمجھ لیجیے کہ ایک چور کسی گھر میں ڈاکہ ڈالتا ہے' پولیس کو اطلاع ہوتی ہے اور چور کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرنے کے لیے چور اور پولیس کا آمنا سامنا ہوتا ہے۔ اُس وقت چور کے لیے پولیس ''دہشت گرد'' ہوئی کیونکہ چور کے لیے پولیس کے ہاتھوں گرفتاری کی دہشت اور خوف ایک طبعی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور اسرائیل کے دلوں میں پاکستان کی انتہائی دہشت چھپی ہے۔ اسی لیے تو مختلف مواقع پر اس خوف کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ جب ۱۹۶۷ء کی جنگ میں عربوں کی شکست پر یہودیوں نے فرانس میں جشن منایا۔ اُس وقت کے اسرائیلی وزیراعظم بن گوریان نے ایک تقریب میں واشگاف اعلان کیا کہ ''یہودی تحریک کے لیے پاکستان کو نظرانداز کرنا انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتا ہے' ہمارے لیے پہلا ہدف پاکستان ہونا چاہیے' کیونکہ پاکستان ایک نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے اور یہی نظریہ ہماری منزل مقصود کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے' چنانچہ ہمارے لیے ہماری لیے انتہائی ضروری ہے کہ ہم جلد از جلد پاکستان کے خلاف ٹھوس اور پُرزور اقدامات کا آغاز کریں۔''

بہرحال یہ تو ہمیشہ پاکستان سے خوفزدہ رہیں گے' لیکن عوامی سطح پر ''دہشت گردی'' کی اصطلاح کو سمجھنے کے لیے نہ تو امریکہ کی کسی ڈکشنری میں اس کی ٹھوس تعریف اور وضاحت ملتی ہے اور نہ امریکہ کے کسی صدر' وزیراعظم' سیاست دان یا قانون دان نے دہشت گردی کی ٹھوس تعریف کرنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ کرے بھی کیوں' کہ اسے اپنے حق میں استعمال جو کرنا ہے!

یہ لفظ ۱۷۹۰ء میں پہلی مرتبہ انقلابِ فرانس کے دوران استعمال ہوا' جبکہ امریکہ کی آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق اس کی وضاحت کچھ یوں کی گئی:

"The use of violent actions in order to achieve political aims or to force a government to act."

اسی وضاحت اور تعریف کو مدِنظر رکھتے ہوئے امریکہ کو ''عالمی دہشت گرد'' کہنا یقیناً انصاف کا تقاضا ہے۔ ہماری بات سے میرے ملک کے بعض دور اندیش' روشن خیال اور ترقی پسند حضرات یقیناً اختلاف کریں گے' لیکن شاید کوئی مندرجہ ذیل حضرات کی تائیدات کی بنا پر ہی ہمارے موقف سے اتفاق کرلے۔

امریکی جنگ آزادی کے دوران برطانوی حکومت کی طرف سے بینجمن فرینکلن

(Benjamin Franklin) اور جارج واشنگٹن (George Washington) کو ''عالمی دہشت گرد'' قرار دیا گیا تھا۔ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۶ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اجلاس کے دوران وینزویلا کے صدر ہوگو چیوز (Hugo Chavez) نے جارج بش کو ''شیطان'' اور ''دہشت گرد'' قرار دیا تھا۔ دسمبر ۲۰۰۵ء میں The Irish Times کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے بولویا (Bolivia) کے صدر ایوو مورالس (Evo Morales) نے جارج بش کو ''دہشت گرد'' قرار دیا تھا۔ جنوری ۲۰۰۶ء میں امریکہ کے مشہور موسیقار ہیری بیلافونٹی نے جارج بش کو ''دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد'' قرار دیا تھا۔ اگست ۲۰۰۵ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر جارج گیلووے نے جارج بش کو دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ جارج بش اور ٹونی بلیئر کے ہاتھ اُن لوگوں کی بنسبت زیادہ خون آلود ہیں جو لندن دہشت گردی کے واقعات میں ملوث پائے گئے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اگر کوئی شخص کسی بے گناہ انسان کو تکلیف پہنچائے بغیر جارج بش اور ٹونی بلیئر پر خودکش حملہ کرے گا تو یہ عین انصاف ہوگا۔ ۲۵ جولائی ۲۰۰۶ء کو نیدرلینڈ کی نوبل انعام یافتہ ہیٹی ولیمز نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ''مجھے جارج بش کو قتل کرنے کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے۔''

اپنی خونخواری' درندگی' سفاکی اور بربریت کو دنیا کی نظروں سے چھپانے اور اپنے مذموم مقاصد کے حصول میں اسلام اور مسلمانوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے اسلام کو دہشت گردی سے جوڑنے اور اسے ایک خطرناک اور خونخوار مذہب کے طور پر پیش کرنے کے لیے پُرزور پراپیگنڈا اور سرتوڑ ناکام کوششیں کی جا رہی ہیں' جس کے لیے ماہانہ کروڑوں ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں اور مسلمانوں میں سے سلمان رشدی جیسے ملعون لوگوں کو پیدا کرنے اور خریدنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ لیکن اسلام کے مطالعے سے لوگ یہ بات سمجھ جاتے ہیں کہ اسلام عالمگیر امن کا داعی ہے اور پرامن معاشرے کے لیے مختلف مذاہب کے ہوتے ہوئے بھی باہمی محبتوں کا وجود ضروری ہے۔ اسی محبت کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مختلف مقامات سے مٹی کو جمع کر کے تخلیق فرمایا۔ اس حقیقت کو جاننے کے بعد پراپیگنڈا سے متاثر افراد فطری طور پر اسلام قبول کرنے پر رضامند ہو جاتے ہیں۔ یورپ میں اسلام کے تیزی سے پھیلاؤ کو روکنے اور اس کے آگے بند باندھنے کے لیے متبادل راستے کے طور پر ''ہر

مسلمان دہشت گرد نہیں' لیکن ہر دہشت گرد مسلمان ہے'' کے نعرے کو عالمی میڈیا میں فروغ دیا جارہا ہے' جس نے اسلام کی طرف رغبت رکھنے والے غیر مسلموں اور ہمارے بعض دانشوران اور ترقی یافتہ طبقے کو بھی کسی حد تک متاثر کیا ہوا ہے' جسے حقیقت اور تاریخ کے آئینے میں جانچنے کی ضرورت ہے' تاکہ غیر مسلموں کو اسلام پر مطمئن کرنے کا سامان ہو سکے اور یہ ہماری مزید استقامت کا سبب بنے۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات کا اگر جائزہ لیا جائے تو حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ ۱۳ مارچ ۱۸۸۱ء کو ایک دھماکے میں روس کے بادشاہ الیگزینڈر دوم کو قتل کیا گیا جبکہ اُس کے ساتھ دیگر بیس افراد بھی ہلاک ہوئے۔ یہ واقعہ ایک غیر مسلم شخص کے ہاتھوں پیش آیا۔ ۴ مئی ۱۸۸۶ء کو شکاگو میں لیبر ریلی کے دوران ایک دھماکہ ہوا جس میں ۱۱ افراد ہلاک اور ۷ زخمی ہوئے' جس کی ذمہ داری انارکسٹ نے قبول کی جو کہ غیر مسلم تھا۔ ۶ ستمبر ۱۹۰۱ء کو امریکہ کے صدر ولیم میکنلے (William McKinley) ایک غیر مسلم شخص کے ہاتھوں قتل ہوا۔ یکم اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مسیحی برادری سے تعلق رکھنے والے دو افراد جیمز اور جوزف نے ٹائمز اخبار کی عمارت کو دھماکے سے اڑا دیا جس میں ۲۱ افراد ہلاک ہوئے۔ ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو آسٹریلیا کے آرکوڈوک (Archduke Franz) اور اس کی بیوی ایک بوسنائی سرب کے ہاتھوں قتل ہوئے' جو جنگ عظیم اول کا پیش خیمہ بنا۔

۱۶/اپریل ۱۹۲۵ء کو بلغاریہ کی کمیونسٹ پارٹی نے بلغاریہ کے ST Nadella چرچ میں دھماکہ کیا جس میں ۱۵۰ افراد ہلاک اور ۵۰۰ سے زائد زخمی ہوئے۔ اس کو بلغاریہ کی سب سے بڑی دہشت گردانہ کارروائی شمار کیا جاتا ہے۔ ۹/اکتوبر ۱۹۳۴ء کو یوگوسلاویہ کے کنگ الیگزینڈر اول (Alexander I) کا ایک سکیورٹی گارڈ کے ہاتھوں قتل ہوا' جو مسلمان نہیں تھا۔ یکم مئی ۱۹۶۱ء کو Ramirez Ortiz نے امریکی جہاز کو ہائی جیک کیا' جو ایک غیر مسلم تھا۔ ۲۸ اگست ۱۹۶۸ء کو گوئٹے مالا کا امریکی سفیر جون گارڈن (John Gordon Mein) ایک غیر مسلم کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ۳ ستمبر ۱۹۶۹ء کو برازیل میں امریکی سفیر کو ایک غیر مسلم شخص نے اغوا کیا۔ ۳۰ جولائی ۱۹۶۹ء کو جاپان میں امریکی سفیر پر چاقو سے وار کیا گیا۔ حملہ آور یقیناً ایک غیر مسلم تھا۔ ۱۹/اپریل ۱۹۹۵ء کو مسیحی برادری کے دو افراد ٹی موتھی اور ٹیری نے اوکلوہاما شہر کی فیڈرل

بلڈنگ میں دھماکہ کیا جس میں ۱۶۶ جانیں ضائع ہوئیں اور ۱۰۰ سے زائد افراد زخمی ہوئے۔

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۸ء تک مختلف یہودی تنظیموں کی دہشت گردی کے تقریباً ۲۶۰ واقعات نوٹ کیے گئے۔ ۲۲ جولائی ۱۹۴۶ء کو Right-wing Zionist کے لیڈر Menachem Begin نے یروشلم میں واقع برطانوی ایڈمنسٹریشن ہیڈ کوارٹر ''کنگ داؤد ہوٹل'' میں دھماکے کروائے جس میں ۹۱ افراد ہلاک اور ۴۰ سے زائد زخمی ہوئے' جسے برطانیہ نے ''عظیم دہشت گرد'' قرار دیا' جبکہ ۱۹۷۸ء میں اسی ''عظیم دہشت گرد'' کو نوبل پرائز سے نوازا گیا۔

۹ مئی ۱۹۷۸ء کو ایک غیر مسلم کے ہاتھوں اٹلی کے ایلڈو مورو کا قتل ہوا۔ ۲۰ مارچ ۱۹۹۵ء کو Cult Movement Aum Shinrikyo نامی تنظیم کے رکن اور بدھ مت سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے ٹوکیو کی شاہراہ میں زہریلی گیس چھوڑی جس سے ۱۲ افراد جاں بحق جبکہ ہزاروں متاثر ہوئے۔ امریکہ میں گزشتہ سو سال کے دوران Irish Republican Army کے ہاتھوں دہشت گردی کے متعدد واقعات دیکھے گئے۔ ۱۹۷۲ء میں تین دھماکے کیے جس میں بیس سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں دو دھماکے کیے جس میں ۲۵ سے زائد ہلاک اور ۲۰۰ سے زائد افراد زخمی ہوئے۔ ۱۹۹۶ء میں لندن میں دھماکہ کیا جس میں دو افراد ہلاک اور ۱۰۰ سے زائد زخمی ہوئے۔ ۱۹۹۶ء میں مانچسٹر کے شاپنگ مال میں ایک زبردست دھماکہ کیا جس سے نامعلوم افراد قتل اور ۲۰۰ سے زائد زخمی ہوئے۔ اگست ۱۹۹۸ء میں بین بریج (Ban Bridge) کے دھماکے میں ۳۰ سے زائد زخمی ہوئے۔ سپین اور فرانس میں ای ٹی اے (Euskadi Ta Askatasuna) دہشت گردی کے ۳۶ واقعات میں ملوث پایا گیا۔

۵ جون ۱۹۸۴ء کو امرتسر (انڈیا) میں انڈین فورسز نے گولڈن ٹیمپل پر حملہ کیا جس میں ۱۰۰ افراد ہلاک ہوئے۔ ۳۱/اکتوبر ۱۹۸۴ء کو بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کو سکھ مذہب سے تعلق رکھنے والے سکیورٹی گارڈ نے قتل کیا۔ بیسویں صدی میں ۲/اکتوبر ۲۰۰۴ء کو عیسائی دہشت گردوں نے ۴۴ ہندوؤں کو قتل کیا۔ ۱۹۹۰ء سے لے کر ۲۰۰۶ء تک شمالی مشرقی انڈیا کی ایک تنظیم United Liberation Front of Assam کو دہشت گردی کے ۴۹۷ واقعات میں ملوث پایا گیا۔ بھارت کے چھ سو علاقوں میں سے ایک سو پچاس علاقوں پر یعنی ایک تہائی بھارت پر محیط نیپال کی Maoists تنظیم نے ۷ سالوں میں دہشت گردی کے ۹۹ واقعات

سرانجام دیے ۔۴/ جنوری ۲۰۱۷ء بروز جمعہ کو لندن کے پارسنز گرین سٹیشن پر صبح ۸:۲۰ پر زوردار دھماکہ ہوا جس میں ۳۰ افراد زخمی ہوئے ۔اس کے علاوہ بھی بیسیوں واقعات ایسے ہیں جن میں آپ کو کسی مسلمان کا نام تک دکھائی نہیں دے گا۔ اور اگر کہیں پر دعویٰ کیا گیا ہے تو وہ بے جا اور بلاثبوت ہے' اور اگر دعویٰ ٹھوس ثبوتوں کی بنیاد پر ہے تب بھی یہ حملہ آور کا ذاتی فعل ہے' اسلام تو کسی بے گناہ کے قتل کی اجازت نہیں دیتا بلکہ مذمت کرتا ہے۔

یوگنڈا میں Lords Salvation Army کے نام سے عیسائیوں کی دہشت گرد تنظیم موجود ہے۔ سری لنکا میں ''تامل ٹائیگرز'' کی دہشت گرد تنظیم' جو خودکش حملوں کے لیے مشہور ہے' پائی جاتی ہے۔ یہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ پنجاب میں ''بجرنگ دل'' کے نام سے سکھوں کی دہشت گرد تنظیم پائی جاتی ہے —— لیکن ان میں سے کسی کو بھی ''ہندو دہشت گرد' سکھ دہشت گرد' عیسائی دہشت گرد'' کہہ کر پکارنے اور سننے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا' بلکہ ان کی دہشت گردی کو ان کی تنظیموں کے ساتھ ہی منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ تاہم کسی جگہ ایک ناسمجھ مسلمان کی چھوٹی سی غلطی کو بھی اسلام سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ **فافھم و تدبّر!**

عراق' لیبیا' مصر' افغانستان' فلسطین اور لبنان میں لاکھوں لوگ قتل کیے گئے۔ ان تمام واقعات میں بمشکل ہی کوئی مسلمان شریک رہا ہوگا' لیکن اگر کہیں بدقسمتی سے کچھ مسلمان دہشت گردی کے واقعات میں ملوث پائے جاتے ہیں تو معدودے چند مسلمانوں کی وجہ سے ان کے دین کی تعلیمات سے انکار کرنا انتہائی درجے کی بیوقوفی ہے۔ اس کی مثال آپ یوں سمجھ لیجیے کہ ایک شخص کو گاڑی چلانی نہیں آتی اور وہ ٹویوٹا (Toyota) کمپنی کی اعلیٰ ترین گاڑی میں بیٹھ کر کسی کھمبے سے جا ٹکراتا ہے اور بعد میں کہتا ہے کہ کمپنی نے ٹھیک گاڑی نہیں بنائی تو کوئی احمق ہی ہوگا جو اس کی اس بات پر قہقہہ نہ لگائے' کیونکہ کھمبے سے جا ٹکرانا گاڑی کی نہیں بلکہ چلانے والی کی ناسمجھی اور کم علمی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان دہشت گردی اور انتہا پسندی کے واقعات میں ملوث پایا جائے تو اس کی وجہ اسلام کی تعلیمات نہیں بلکہ اُس مسلمان کا اسلام کو نہ سمجھنا ہے۔ اس کے باوجود مذہب کے تناظر میں درندگی' سفاکی' بربریت اور انسانوں پر ہونے والے مظالم اور زیادتیوں کا جائزہ لیا جائے تب بھی دیگر ناانصافیوں اور انسانیت کا خون بہانے کے حوالے سے مسلمانوں کی تقصیرات ہیچ نظر آنے لگیں گی۔

جرمنی کے ایڈولف ہٹلر (Adolf Hitler) نے ساٹھ لاکھ لوگوں کا قتل عام کیا جو ایک عیسائی تھا۔ دوسری عالمی جنگ جو جرمنی' اٹلی' جاپان' برطانیہ' فرانس' آسٹریلیا' کینیڈا' نیوزی لینڈ' انڈیا' سوویت یونین' چائنا اور امریکہ کے درمیان لڑی گئی' اس جنگ میں تمام ملکوں کی افواج کے ہاتھوں ہلاکتوں کی تعداد کم از کم پانچ کروڑ اور زیادہ سے زیادہ آٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے۔ ان میں کوئی بھی مسلمان ملک شامل نہیں۔ سوویت یونین کے جوزف سٹالن (Joseph Stalin) نے دو کروڑ لوگوں کا خون بہایا' جن میں سے ایک کروڑ چالیس لاکھ افراد کو بھوک سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ چائنا کے ماؤزے تنگ (Mao Tse Tsung) نے ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک کروڑ ساٹھ لاکھ لوگوں کو فنا کے گھاٹ اتارا۔ اس باب میں مسولینی نے بھی حصہ لیا اور چار لاکھ لوگوں کا قتل عام کیا۔ میکسی میلین (Maximillian Robespierre) نے انقلابِ فرانس کے دوران چار لاکھ لوگوں کو قتل کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اشوکا نے کلنگا کی جنگ میں ایک لاکھ افراد کو قتل کیا تھا جو ایک ہندو تھا۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ عراق کے صدام حسین کے ذمہ بھی کئی ہزار لوگوں کا خون ہے اور انڈونیشیا کے محمد سوہارتو نے بھی تقریباً پانچ لاکھ لوگوں کے قتل کرنے کا اعزاز اپنے نام کیا ہے' لیکن یہ تعداد باقی تمام جنگوں اور دہشت گردی کے واقعات جو غیر مسلموں کے ذریعے انجام پائے' کے مقابلے میں کئی گنا کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

ان تاریخی حقائق سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور اسے کسی بھی مذہب کی تعلیمات سے جوڑنا قرین انصاف نہیں۔ ہاں! ایک بات ضرور ہے' اگر مستقبل قریب یا بعید میں دہشت گردی کے لیے کسی مذہب یا نام کے انتخاب پر غور کیا جائے تو دہشت گردی کے مذہب کا نیا نام ''امریکہ'' ہونا چاہیے اور دہشت گردوں کے کمانڈروں کے نام جارج واشنگٹن' جارج بش' ٹونی بلیئر اور ڈونلڈ ٹرمپ ہونے چاہئیں' کیونکہ ان کی اپنی ''آکسفورڈ ڈکشنری'' کی تعریف کے مطابق یہ حضرات ''عالمی دہشت گرد'' قرار دیے جا چکے ہیں۔ اس تناظر میں سب سے بڑے ''جھوٹے اور مکار'' کہلائے جانے کے لائق یہی حضرات ہیں جو ''انسانیت'' اور ''مذہبی رواداری'' کا ڈھونگ رچا کر ''مساوات'' کا علم ہاتھ میں لیے ساری دنیا کو ویران کرنے چل پڑے ہیں۔

❀ ❀ ❀

Feb 2018
Vol.67

Regd. CPL No.115
No.2

Monthly **Meesaq** Lahore

امام یحییٰ بن شرف الدّین النّووی رحمہ اللہ کے مجموعۂ احادیث

اربعینِ نووی رحمۃ اللہ علیہ

کی تشریح و توضیح پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے خطاباتِ جمعہ

❁ دیدہ زیب ٹائٹل ❁ امپورٹڈ بک پیپر ❁ معیاری طباعت
❁ 852 صفحات ❁ دو حصوں پر مشتمل ضخیم کتاب
❁ قیمت 600 روپے

خود پڑھیے ...... احباب کو تحفہ میں دیجیے!

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 3-35869501
email: maktaba@tanzeem.org website: www.tanzeem.org